فہرست

جاوید احمد غامدی

قرآن کا موضوع

قرآن کے بارے میں یہ بات اس کا ایک عام قاری بھی بہت آسانی کے ساتھ جان سکتا ہے کہ اس کا موضوع صرف وہ حقائق ہیں جن کو ماننے اور جن سے پیدا ہونے والے تقاضوں کو پورا کرنے ہی پر انسان کی ابدی فلاح کا انحصار ہے۔ وہ انھی حقائق کو انفس و آفاق اور تاریخ کے دلائل سے ثابت کرتا ہے، بنی آدم کو انھیں ماننے کی دعوت دیتا ہے، ان کو جھٹلا دینے کے نتائج سے انھیں خبردار کرتا ہے اور ان سے جو تقاضے پیدا ہوتے ہیں، ان کی شرح و وضاحت کرتا ہے۔ ان کے علاوہ کسی چیز سے اسے بحث نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے وہ عالم طبیعی کے بارے میں بھی اگر کچھ کہتا ہے تو اس کا بیان کبھی حقیقت کے خلاف نہیں ہوتا، لیکن اس عالم کے متعلق جو علوم و فنون انسان کی عقل نے دریافت کیے ہیں اور جو وہ آنے والے زمانوں میں دریافت کرے گی، انھیں قرآن مجید کبھی زیر بحث نہیں لاتا۔ اس طرح کی کوئی چیز سرے سے اس کا موضوع ہی نہیں ہے۔

لیکن اسے کیا کہیے کہ اس امت کی تاریخ میں بارہا لوگ اس کتاب کو اس کی اس اصلی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ یہ چونکہ اللہ کی کتاب ہے، اس لیے دنیا کے سارے علوم و فنون اس میں لامحالہ ہونے چاہییں۔ اس کے بعد وہ اپنے اس مقدمے کو ثابت کرنے کے لیے اس بات کے درپے ہوئے کہ کسی طرح ان علوم و فنون کے ماخذ اس کی آیات میں سے ڈھونڈ نکالے جائیں۔ چنانچہ زبان و بیان اور نظم کلام کی ہر دلالت کو نظر انداز کر کے کبھی فلسفۂ یونان کے اوہام اس سے ثابت کیے گئے، کبھی ایک خاص زمانے کی سائنسی معلومات کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ وہ درحقیقت اس کی فلاں اور فلاں آیت سے اخذ کی گئی ہیں، کبھی علم طب اور نجوم و فلکیات کے بعض عقائد اس سے برآمد کیے گئے، اور کبھی انسان کے ایٹم بم بنانے اور چاند پر

پہنچنے کا ذکر اس میں سے نکال کر دکھایا گیا۔

یہ ساری زحمت لوگوں کو صرف اس لیے اٹھانا پڑی کہ انھوں نے اس کتاب کے بارے میں بالکل غلط تصور قائم کر لیا۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھے کہ عالم کے پروردگار نے اس کتاب سے پہلے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ جس طرح یہ کتاب پروردگار کی عنایت ہے، اسی طرح عقل بھی اسی کی عنایت ہے۔ چنانچہ جن معاملات میں عقل کی رہنمائی اس کے لیے کافی ہے، ان سے اس کتاب کو کوئی تعلق نہیں اور جن سے یہ کتاب بحث کرتی ہے، ان میں عقل اگر اپنے وجود ہی سے غافل نہ ہو جائے تو اس کی رہنمائی سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

یہ صرف قرآن مجید ہی کا معاملہ نہیں ہے، اللہ کے نبی نے اپنے بارے میں بھی یہ حقیقت اپنے ماننے والوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھائی ہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کھجوروں میں گابھا دیتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اس کے بغیر ہی ٹھیک ہے۔ انھوں نے اس سال گابھا نہیں دیا۔ چنانچہ پھل بہت ردی آیا۔ لوگوں نے آپ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: تم اس طرح کے معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ میں تمھیں اللہ کا دین بتانے آیا ہوں، اس لیے میری طرف صرف اسی کے لیے رجوع کیا کرو۔

ہم اگر قرآن مجید سے فی الواقع ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ اس کی طرف صرف دین کے حقائق و معارف جاننے کے لیے رجوع کریں۔ اپنے سونے کے لیے چارپائی بنانے اور اپنی آواز زہرہ و مریخ تک پہنچانے کے لیے ہمیں اپنی عقل کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے انسان کو اپنے دائرۂ عمل میں کبھی مایوس نہیں کیا۔

قرآن مجید ہم کو یہ بتانے کے لیے نازل کیا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کی رضا ہم اس دنیا میں کن چیزوں کو مان کر اور کن چیزوں پر عمل کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس کی آیات میں اپنی خواہشوں کا مضمون پڑھنے کے بجائے اپنی خواہشوں کو اس کی پیروی کے لیے مجبور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات قرآن میں جگہ جگہ واضح کی ہے کہ اس سے ہدایت حاصل کرنے کی پہلی شرط یہی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص دنیا کے سارے علوم و فنون اسی ایک کتاب میں دیکھنے کی خواہش رکھتا ہو، لیکن اس کی یہ خواہش اس حقیقت کو نہیں بدل سکتی کہ اس میں صرف اس علم کا بیان ہے جو انسان کی ابدی فلاح کے لیے ضروری ہے۔

[۱۹۸۷ء]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۱۹)

(گزشتہ سے پیوستہ)

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ، قُلِ: اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ، وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ

وہ تم[۱۹۸] سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں[۱۹۹]۔ اُن سے کہہ دو کہ اللہ تمھیں اُن کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جن عورتوں کے حقوق تم ادا نہیں کرنا چاہتے[۲۰۰]، مگر اُن سے نکاح کرنا چاہتے ہو، اُن کے یتیموں سے متعلق جو ہدایات اِس کتاب میں دی جا رہی ہیں[۲۰۱]، اُن کے بارے میں اور (دوسرے) بے سہارا

[۱۹۸] یہاں سے آگے اب خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اِن میں سلسلۂ بیان اِس طرح ہے کہ ابتدا اور انتہا میں بعض سوالوں کا جواب ہے جو اِس سورہ کے احکام سے متعلق لوگوں نے اِس کی تلاوت کے دوران میں کیے اور درمیان میں مسلمانوں، منافقین اور اہل کتاب کے اُن رویوں پر تنبیہ ہے جو اِس سورہ کے مباحث سے متعلق اُن کی طرف سے ظاہر ہوئے۔ مثلاً، بعض مسلمانوں کا یہ رویہ کہ وہ منافقین کے ساتھ دوستی اور تعلقات کو ترجیح دیتے اور اُن کے مقابلے میں حق کی گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اِسی طرح یہود کا یہ رویہ کہ وہ اُسی کتاب پر ایمان لائیں گے جسے وہ آسمان سے اترتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

[۱۹۹] یہ استفتا کس نوعیت کا تھا؟ اِس کی وضاحت آگے اِس کے جواب سے ہو جاتی ہے۔ قرآن کا عام اسلوب

تَنۡکِحُوۡهُنَّ، وَالۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الۡوِلۡدَانِ، وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡیَتٰمٰی بِالۡقِسۡطِ، وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِهٖ عَلِیۡمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡ بَعۡلِهَا

بچوں کے بارے میں بھی فتویٰ دیتا ہے (کہ عورتوں کے حقوق ہر حال میں ادا کرو) اور یتیموں کے ساتھ (ہر حال میں) انصاف پر قائم رہو[202] اور (یاد رکھو کہ) اِس کے علاوہ بھی جو بھلائی تم کرو گے، وہ اللہ کے علم میں رہے گی۔ ہاں، اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بے زاری[203] یا بے پروائی کا اندیشہ ہو تو اِس

ہے کہ اُس میں سوالات اِسی طرح اجمال کے ساتھ نقل ہوتے ہیں۔ غور کیجیے تو یہی طریقہ قرین بلاغت ہے، اِس لیے کہ سوال اگر جواب سے واضح ہے تو اُس کا نقل کرنا محض طول کلام کا باعث ہوگا۔

[۲۰۰] اصل الفاظ ہیں: 'لَا تُؤۡتُوۡنَهُنَّ مَا کُتِبَ لَهُنَّ'۔ یعنی اُن کو تم وہ نہیں دیتے جو اُن کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ مہر اور عدل کی اُس شرط کی طرف اشارہ ہے جو اِس سورہ کی آیات ۳-۴ میں یتیموں کی ماؤں کے ساتھ نکاح میں بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔

[۲۰۱] اصل میں 'وَمَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فِی الۡکِتٰبِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا عطف ہمارے نزدیک 'فِیۡهِنَّ' کی ضمیر مجرور پر ہے اور 'الکتٰب' سے مراد اِس جملے میں قرآن مجید ہے۔

[۲۰۲] یہ وہ فتویٰ ہے جو لوگوں کے استفتا کے جواب میں ارشاد ہوا ہے۔ اِس کے لیے اصل میں 'وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡیَتٰمٰی بِالۡقِسۡطِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا معطوف علیہ اِس جملے میں محذوف ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''... یہاں کلام میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے جو 'وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا' کا معطوف علیہ بن سکے۔ اِس وجہ سے لازماً یہاں محذوف ماننا پڑے گا اور یہ محذوف سیاق کلام کی روشنی میں معین کیا جائے گا۔ چنانچہ یہاں 'وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا' سے پہلے یہ مضمون محذوف ہوگا کہ اِن عورتوں کو اِن کے مہر دو، اِن کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو، پھر اِس کے اوپر 'وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡیَتٰمٰی بِالۡقِسۡطِ' کا عطف موزوں ہوگا۔ یعنی اور یتیموں کے لیے عدل کی حفاظت کرنے والے بنو۔ گویا فتوے میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ مہر اور عدل کی شرط جس طرح عام عورتوں کے معاملے میں ہے اُسی طرح یتیموں کی ماؤں کے بارے میں بھی ہے اور آیت 'وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا' میں عورتوں کے ساتھ عدل کا اور آیت 'وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ' میں اداے مہر کا جو حکم ہے تو وہ یتیموں کی ماؤں سے متعلق ہی ہے، جن سے

نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا، فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا، وَالصُّلْحُ خَيْرٌ، وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ، وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا﴿۱۲۸﴾

میں حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی سمجھوتا کر لیں۔ (اِس لیے کہ) سمجھوتا بہتر ہے[۲۰۴]۔ اور (یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ) حرص لوگوں کی سرشت میں ہے[۲۰۵]۔ لیکن حسنِ سلوک سے پیش آؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو جو کچھ تم کرو گے، اللہ اُسے جانتا ہے۔ ۱۲۷-۱۲۸

تم نکاح تو کرنا چاہتے ہو، لیکن مہر اور عدل کی کھکھیڑ میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ اِس طرح گویا قرآن نے آیات ۳-۴ کے اجمال کو کھول دیا اور اِس فتوے کے ذریعے سے اُن میں دیے ہوئے احکام کو مزید مؤکد کر دیا۔‘‘

(تدبر قرآن ۲/ ۳۹۷)

[۲۰۳] اصل میں ’نُشُوْز‘ کا لفظ آیا ہے۔ یہ اگر مرد کی طرف سے ہو تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بیوی کو بیوی سمجھ کر اُس سے معاملہ کرنے سے انکار کر رہا ہے۔

[۲۰۴] یہ عورت کو نصیحت فرمائی ہے کہ اگر اُسے اندیشہ ہو کہ بیویوں میں برابری کے حقوق پر اصرار کے نتیجے میں مرد اُس سے بے پروائی برتے گا یا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے گا تو اِس میں حرج نہیں کہ دونوں مل کر آپس میں کوئی سمجھوتا کر لیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...یعنی عورت اپنے حق مہر، عدل اور نان نفقے کے معاملے میں ایسی رعایتیں شوہر کو دے دے کہ قطع تعلق کا اندیشہ رفع ہو جائے۔ فرمایا کہ صلح اور سمجھوتے ہی میں بہتری ہے، اس لیے کہ میاں اور بیوی کا رشتہ ایک مرتبہ قائم ہو جانے کے بعد فریقین کی فلاح اِسی میں ہے کہ یہ قائم ہی رہے، اگرچہ اس کے لیے کتنا ہی ایثار کرنا پڑے۔ فرمایا کہ حرص طبائع کی عام بیماری ہے جو باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے اور اِس کا علاج یہی ہے کہ یا تو دونوں فریق ایثار پر آمادہ ہوں اور اگر ایک فریق کا مرض لاعلاج ہے تو دوسرا قربانی پر آمادہ ہو۔ غرض رشتۂ نکاح کو برقرار رکھنے کے لیے اگر عورت کو قربانی بھی دینی پڑے تو بہتری اُس کے برقرار رہنے ہی میں ہے۔ اس کے بعد ’وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا‘ کے الفاظ سے مرد کو اُبھارا ہے کہ ایثار و قربانی اور احسان و تقویٰ کا میدان اصلاً اُسی کے شایان شان ہے، وہ اپنی فتوت اور مردانگی کی لاج رکھے اور عورت سے لینے والا بننے کی بجائے اُس کو دینے والا بنے۔ اللہ ہر ایک کے

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ، وَلَوْ حَرَصْتُمْ، فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ
فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ، وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴿١٢٩﴾
وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ، وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا﴿١٣٠﴾

بیویوں کے درمیان پورا انصاف تو اگر تم چاہو بھی تو نہیں کر سکتے، اِس لیے اتنا کافی ہے کہ ایک کی طرف اِس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری اُدھر میں لٹکتی رہ جائے۔ ہاں، اگر اپنے آپ کو درست کرتے رہو گے اور اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۲۰۶] اور اگر میاں بیوی، دونوں الگ ہی ہو جائیں گے تو اللہ اُن میں سے ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ بڑی وسعت رکھنے والا اور بڑی حکمت والا ہے۔[۲۰۷] ۱۲۹-۱۳۰

ہر عمل سے باخبر ہے اور ہر نیکی کا وہ بھرپور صلہ دے گا۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۹۹)

[۲۰۵] اصل الفاظ ہیں: 'وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...'شُح' کے معنی بخل کے بھی ہیں اور حرص کے بھی۔ بخل تو یہ ہے کہ آدمی اداے حقوق میں تنگ دلی برتے۔ یہ چیز ہر حال میں مذموم ہے۔ لیکن حرص اچھی چیز کی بھی ہو سکتی ہے، بری چیز کی بھی، حد کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور حد سے باہر بھی، اِس وجہ سے اِس کا اچھا اور بُرا ہونا ایک امر اضافی ہے۔ اپنے اچھے پہلو کے اعتبار سے یہ انسانی فطرت کے اندر اپنا ایک مقام رکھتی ہے، لیکن اکثر طبائع پر اِس کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ یہ ایک بیماری بن کے رہ جاتی ہے۔ 'اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ' میں اِس کے اِسی پہلو کی تعبیر ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۹۸)

[۲۰۶] اِس سے واضح ہے کہ بیویوں کے درمیان جس عدل کا تقاضا قرآن نے کیا ہے، اُس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ظاہر کے برتاؤ اور دل کے لگاؤ میں کسی پہلو سے کوئی فرق باقی نہ رہے۔ اِس طرح کا عدل کسی کی طاقت میں نہیں ہے اور کوئی شخص یہ کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ دل کے میلان پر آدمی کو اختیار نہیں ہوتا، لہٰذا قرآن کا تقاضا صرف یہ ہے کہ شوہر ایک بیوی کی طرف اِس طرح نہ جھک جائے کہ دوسری بالکل معلق ہو کر رہ جائے گویا کہ اُس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ برتاؤ اور حقوق میں اپنی طرف سے توازن قائم رکھنے کی کوشش کرو، اگر کوئی حق تلفی یا کوتاہی ہو جائے تو فوراً تلافی کر کے اپنے رویے کی اصلاح کر لو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ تمھاری اِس کوشش کے باوجود اگر کوئی فروگزاشت ہو جاتی ہے تو اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی رحمت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ، وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ، وَيَاْتِ

(یہ خدا کے احکام ہیں۔نہیں مانو گے تو اپنا ہی بُرا کرو گے، اِس لیے کہ) زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے۔تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی، اُنھیں بھی ہم نے یہی ہدایت کی تھی اور تمھیں بھی یہی ہدایت کر رہے ہیں کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور (یاد رکھو کہ) نہیں مانو گے تو (اللہ کا کچھ نہیں بگاڑو گے)، اِس لیے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے اور اللہ بے نیاز ہے، ستودہ صفات ہے۔[208] (ایک مرتبہ پھر سنو کہ) زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے۔ (اِس لیے وہی سزاوار ہے کہ زندگی کے معاملات اُس کے حوالے کیے جائیں۔تمھاری

[۲۰۷] مدعا یہ ہے کہ گھر بچانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ کو یہی مطلوب ہے، لیکن اگر حالات مجبور کر دیتے ہیں اور علیحدگی ہو ہی جاتی ہے تو اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ وہی رزق دینے والا ہے اور مصیبتوں اور تکلیفوں میں اپنے بندوں کا ہاتھ بھی وہی پکڑتا ہے۔ میاں اور بیوی، دونوں کو وہ اپنی عنایت سے مستغنی کر دے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...مطلب یہ ہے کہ اِس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے میاں اور بیوی دونوں سے ایثار اور کوشش تو مطلوب ہے لیکن یہ غیرت اور خودداری کی حفاظت کے ساتھ مطلوب ہے۔ میاں اور بیوی میں سے کسی کے لیے جس طرح اکڑنا جائز نہیں ہے، اِسی طرح ایک حد خاص سے زیادہ دبنا بھی جائز نہیں ہے۔ اگرچہ الفاظ میں عمومیت ہے، لیکن سیاق کلام دلیل ہے کہ اس میں عورتوں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی ہے کہ وہ حتی الامکان نباہنے کی کوشش تو کریں اور مصالحت کے لیے ایثار بھی کریں لیکن یہ حوصلہ رکھیں کہ اگر کوشش کے باوجود نباہ کی صورت پیدا نہ ہوئی تو رزاق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اپنے خزانۂ جود سے اُن کو مستغنی کر دے گا۔'' (تدبرقرآن ۲/ ۴۰۰)

[۲۰۸] یعنی خدا تمھارے لیے کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو اِس لیے نہیں کہ اُس کو اِس کی احتیاج ہے، بلکہ اِس لیے کہ وہ حمید ہے اور اُس کی یہ صفت تقاضا کرتی ہے کہ بے نیاز ہونے کے باوجود تمام مخلوقات کو اپنے جود و کرم سے

بِاٰخَرِيۡنَ، وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيۡرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ، وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيۡعًا بَصِيۡرًا ﴿۱۳۴﴾

نافرمانی کی صورت میں) وہ اگر چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور دوسروں کو (تمھاری جگہ) لے آئے۔ اللہ اِس چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ (اپنے مفادات کی خاطر تم اللہ کی شریعت سے فرار اختیار کرتے ہو۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو دنیا کا صلہ چاہتا ہے تو (دنیا کا صلہ بھی اللہ کے پاس ہے۔ اور جو دنیا اور آخرت، دونوں کا صلہ چاہتا ہے) تو اللہ کے پاس دنیا کا صلہ بھی ہے اور آخرت کا صلہ بھی، اور اللہ سمیع و بصیر ہے۔[۲۰۹] ۱۳۱-۱۳۴

نوازتا رہے۔

[۲۰۹] اس آیت میں حذف کا اسلوب ہے جسے ہم نے ترجمے میں کھول دیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...عربی میں کلام کے دو متقابل اجزا میں سے بعض اجزا کو اِس طرح حذف کر دیتے ہیں کہ مذکور جزو، محذوف کی طرف خود اشارہ کر دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس آیت کے محذوفات کھول دیے جائیں تو تالیف کلام یہ ہوگی 'مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡيَا، وَمَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ ثَوَابَ الۡاٰخِرَةِ فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ'۔ پہلے میں سے 'فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡيَا' کو حذف کر دیا اور دوسرے میں سے 'وَمَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ ثَوَابَ الۡاٰخِرَةِ' کو۔ اِس حذف کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ مذکور ٹکڑے محذوف ٹکڑوں کی نشان دہی خود کر رہے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۰۱)

[باقی]

طالب محسن

یمن، ربیعہ اور مضر کے خصائص

(مسلم، رقم ۵۱-۵۲)

عَنْ أَبِیْ مَسْعُوْدٍ قَالَ: أَشَارَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِیَدِهِ نَحْوَ الْیَمَنِ. فَقَالَ: أَلَا إِنَّ الْإِیْمَانَ هٰهُنَا. وَإِنَّ الْقَسْوَةَ وَغِلَظَ الْقُلُوْبِ فِی الْفَدَّادِیْنَ عِنْدَ أُصُوْلِ أَذْنَابِ الْإِبِلِ حَیْثُ یَطْلُعُ قَرْنَا الشَّیْطَانِ فِی رَبِیْعَةَ وَمُضَرَ.

''حضرت ابومسعود (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف اشارہ کیا۔ پھر فرمایا: سنو، ایمان وہاں ہے۔ دلوں کی قساوت اور سختی ان چرواہوں میں ہے جو اونٹوں کی دموں کے پاس چلاتے رہتے ہیں، جیسے کہ شیطان کے دو سینگ ربیعہ اور مضر میں طلوع ہوتے ہیں۔''

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: جَآءَ أَهْلُ الْیَمَنِ. هُمْ أَرَقُّ أَفْئِدَةً. الْإِیْمَانُ یَمَانٍ وَالْفِقْهُ یَمَانٍ وَالْحِکْمَةُ یَمَانِیَةٌ.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل یمن آئے ہیں، یہ دل کے نرم ہیں۔ ایمان یمنی ہے۔ فقہ یمنی ہے۔ حکمت یمنی ہے۔''

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَتَاكُمْ أَهْلُ الْيَمَنِ. هُمْ أَضْعَفُ قُلُوْبًا وَأَرَقُّ أَفْئِدَةً. اَلْفِقْهُ يَمَانٍ. وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارے پاس اہل یمن آئے ہیں۔ ان کی طبع نازک اور یہ دل کے نرم ہیں۔ فقہ یمنی ہے۔ حکمت یمنی ہے۔''

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: رَأْسُ الْكُفْرِ نَحْوَ الْمَشْرِقِ وَالْفَخْرُ وَالْخُيَلَاءُ فِیْ أَهْلِ الْخَيْلِ وَالْإِبِلِ الْفَدَّادِيْنَ أَهْلِ الْوَبَرِ. وَالسَّكِيْنَةُ فِیْ أَهْلِ الْغَنَمِ.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کفر کی جڑ مشرق کی جانب ہے۔ تکبر اور غرور ہانکا لگانے والے اور خیموں میں رہنے والے اونٹوں اور گھوڑوں والوں میں ہے۔ سکینت بکریوں والوں میں ہے۔''

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْإِيْمَانُ يَمَانٍ. وَالْكُفْرُ قِبَلَ الْمَشْرِقِ. وَالسَّكِيْنَةُ فِیْ أَهْلِ الْغَنَمِ. وَالْفَخْرُ وَالرِّيَاءُ فِی الْفَدَّادِيْنَ أَهْلِ الْخَيْلِ وَالْوَبَرِ.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان یمنی ہے۔ کفر مشرق کی جانب ہے۔ سکینت بکریوں والوں میں ہے۔ تکبر اور دکھاوا ہانکا لگانے والے خیموں میں رہنے والے اونٹوں والوں میں ہے۔''

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: اَلْفَخْرُ وَالْخُیَلَاءُ فِی الْفَدَّادِیْنَ أَهْلِ الْوَبَرِ. وَالسَّکِیْنَةُ فِی أَهْلِ الْغَنَمِ.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: غرور و تکبر اونٹوں کے پیچھے چلانے والے، خیموں میں رہنے والوں میں ہے اور سکینت بکریوں والوں میں ہے۔''

عَنِ الزُّهْرِیِّ بِهٰذَا الْإِسْنَادِ مِثْلَهُ وَزَادَ الْإِیْمَانُ یَمَانٍ وَالْحِکْمَةُ یَمَانِیَةٌ.

''زہری اسی سند سے یہی روایت اس اضافے کے ساتھ کرتے ہیں: ایمان یمنی ہے۔ حکمت یمنی ہے۔''

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: جَآءَ أَهْلُ الْیَمَنِ هُمْ أَرَقُّ أَفْئِدَةً وَأَضْعَفُ قُلُوْباً. اَلْإِیْمَانُ یَمَانٍ وَالْحِکْمَةُ یَمَانِیَةٌ. اَلسَّکِیْنَةُ فِی أَهْلِ الْغَنَمِ وَالْفَخْرُ وَالْخُیَلَاءُ فِی الْفَدَّادِیْنَ أَهْلِ الْوَبَرِ قِبَلَ مَطْلَعِ الشَّمْسِ.

''حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: اہل یمن آئے ہیں۔ یہ دل کے نرم اوران کی طبع نازک ہے۔ ایمان یمنی ہے۔ حکمت یمنی ہے۔ سکینت بکریوں والوں میں ہے۔ تکبر اور غرور خیموں میں رہنے والے، اونٹوں کے پیچھے چلانے والوں میں ہے، جوسورج کے طلوع ہونے کی سمت میں رہتے ہیں۔''

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَاكُمْ أَهْلُ الْيَمَنِ. هُمْ أَلْيَنُ قُلُوْبًا وَأَرَقُّ أَفْئِدَةً. الْإِيْمَانُ يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ. رَأْسُ الْكُفْرِ قِبَلَ الْمَشْرِقِ.

''حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارے پاس اہل یمن آئے ہیں۔ یہ دل کے نرم اور طبع کے نازک ہیں۔ ایمان یمنی ہے۔ حکمت یمنی ہے۔ کفر کا مرکز مشرق کی جانب ہے۔''

لغوی مباحث

'اَلْقَسْوَةَ وَغِلَظَ الْقُلُوْبِ': 'قسوۃ' اور 'غلظ' کم وبیش ہم معنی ہیں۔ 'قسوۃ'، 'لین' (نرمی) کا ضد ہے۔ عربی میں اشیا کی سختی کو بیان کرنے کے لیے 'قسوۃ' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح 'غلظ'، 'رقۃ' (باریک) کا ضد ہے۔ یہ اشیا کے موٹے اور گاڑھے ہونے کے پہلو کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ معنوی پہلو سے 'قسوۃ' اور 'غلظ' کے الفاظ دل کی نصیحت پذیری اور شفقت ورافت سے محرومی کو بیان کرنے کے لیے آتے ہیں۔

'اَلْفَدَّادِيْنَ': 'فداد' کی جمع ہے۔ 'فداد' کا لفظ کئی معنی میں آتا ہے۔ متکبر، بہت چلانے والا، بہت روندنے والا، اور سینکڑوں ہزاروں اونٹوں کا مالک۔ اس روایت میں یہ دوسرے معنی میں آیا ہے۔ اگرچہ متکبر اور اونٹوں کے مالک سے بھی روایات کا ترجمہ ہو جاتا ہے، لیکن ایک روایت کے متن میں 'عند أصول أذناب الإبل' کی تصریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ متکلم کا منشا کیا ہے۔ مزید برآں یہ معنی لینے میں کوئی تکلف بھی نہیں ہے۔

’أفـئدة‘ اور’الـقلب‘: ’أفـئدة‘، ’فؤاد‘ کی جمع ہے۔ ’فؤاد‘ اور ’قلب‘ بھی ہم معنی ہیں۔قرآن مجید کی ایک آیت میں دونوں لفظ بالکل مترادف کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں۔سورۂ قصص (۲۸) کی آیت ۱۰ میں ہے:
’وَاَصۡبَحَ فُـؤَادُ اُمِّ مُـوۡسٰـی فٰـرِغًا، اِنۡ کَادَتۡ لَتُبۡدِیۡ بِهٖ لَوۡلَآ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰی قَلۡبِهَا لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡـمُؤۡمِنِیۡنَ‘، (اور موسیٰ کی ماں کا دل بالکل بے چین ہوگیا۔قریب تھا کہ وہ اس راز کو ظاہر کردیتی، اگر ہم اس کے دل کو نہ سنبھالتے کہ وہ اہل ایمان میں سے بنی رہے)۔آیت میں پہلے ’فؤاد‘ آیا ہے اور بعد میں ’قلب‘ آیا ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے ترجمے میں دونوں کے لیے دل ہی کا لفظ اختیار کیا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے لفظ ’جی‘ اور ’دل‘ کی طرح یہ مترادف بھی ہیں اور ان کے محل استعمال میں فرق بھی ہے۔بعض شارحین کے نزدیک ’فؤاد‘ جذبات کے پہلو کو اور ’قـلب‘ عقل کے پہلو کو لیے ہوئے ہوتا ہے۔بعض کے نزدیک ’قـلب‘ عموم پر ہے اور ’فؤاد‘، ’قلب‘ کی گہرائی کے لیے آتا ہے۔

’اَلۡفِقۡهُ‘ اور’اَلۡحِکۡمَةُ‘: ’فقه‘ کا لفظ سمجھ اور ’حکمة‘ کا لفظ دانائی کے معنی میں آتا ہے۔بعد میں شریعت کے فروع واطلاق کے علم کو فقہ کہا جانے لگا۔لغوی اعتبار سے ’فـقه‘ انسان کی فہم کی صلاحیت کا نام ہے اور حکمت اس صلاحیت کے حاصلات کا نام ہے۔یہ حاصلات ہر معاشرے میں تجربات کے نتائج، اقدار اور اخلاقی اصولوں کی صورت میں موجود رہتے ہیں۔جنھیں صحیح محل میں برتنے کو حکمت کہا جاتا ہے۔

’أَهۡـلِ الۡوَبَرِ‘: ’وبر‘ اونٹ کے بالوں کے لیے آتا ہے۔’اهـل الوبر‘ کی تعبیر خیموں میں رہنے والے خانہ بدوش قبائل کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔

’الۡـفَخۡرُ وَالۡخُیَلَاءُ‘: ’فخر‘ کا لفظ دنیا کی نعمتوں دولت، حسن، اقتدار اور علم وغیرہ کے حاصل ہونے پر اپنے آپ کو بڑا سمجھنے اور ان پر اترانے کے لیے آتا ہے۔’خیـلاء‘ کا لفظ تکبر کے معنی میں آتا ہے۔اس میں اپنی بڑائی کے خیال کے ساتھ دوسروں کی تذلیل اور تحقیر کا جذبہ بھی شامل ہوتا ہے۔

’اَلسَّکِیۡنَةُ‘: سکینت کا لفظ وقار اور سکون کے معنی میں آتا ہے۔یہ تھڑدلے پن اور بے صبری کی نفی پر دلالت کرتا ہے۔

’الـضعف‘: ’ضعف‘ کا اردو مترادف کمزوری ہے۔اردو میں دل کے لیے کمزوری کا لفظ مثبت معنی نہیں رکھتا، لیکن عربی میں یہ لفظ دل کی نرمی کو تعبیر کرنے کے لیے آیا ہے، جو ایک مثبت چیز ہے۔

’الرقة‘: ’رقة‘ کے معنی کسی چیز کے پتلے یا باریک ہونے کے ہیں۔حدیث میں یہ لفظ بھی نرمی ہی کے معنی میں آیا ہے۔

’حَیۡثُ یَطۡلُعُ قَرۡنَا الشَّیۡطَان‘: ’’جہاں شیطان کے دو سینگ طلوع ہوتے ہیں۔‘‘ مشرق کے لیے یہ تعبیر سورج پرستوں کی مناسبت سے استعمال کی گئی ہے، اس لیے کہ وہ اس موقع پر سورج کی پرستش کرتے تھے۔

’ربیعة و مضر‘: یہ مشرق میں رہنے والے دو قبائل کے نام ہیں۔ معد بن نزار بن عدنان کے دو بیٹوں کے نام ہیں۔ یہ نجد کا علاقہ ہے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کی دعوت کی شدید مخالفت کی تھی۔

معنی

اس روایت میں اہل یمن کے بعض محاسن بیان کیے گئے ہیں۔ اسی طرح اہل مشرق یعنی مضر اور ربیعہ کے خانہ بدوش قبائل کی مذمت کی گئی ہے۔ اس روایت کے مختلف متون کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے پس منظر میں دعوت کی مخالفت اور موافقت کے رویے ہیں۔ اس سے آپ کی ہرگز مراد یہ نہیں ہے کہ تمام اہل یمن بغیر کسی استثنا کے اہل خیر ہیں اور مشرق کے مذکورہ قبائل بغیر کسی استثنا کے اہل شر ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان قبائل نے شدید مخالفت ظاہر کی تھی اور اہل یمن کے افراد نے بآسانی حق قبول کر لیا تھا۔ یمن کا علاقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں آپ کی سلطنت کا حصہ بن گیا تھا اور آپ نے خود اس علاقے کے لیے عامل کا تقرر کیا تھا۔ اس کے برعکس نجد کے مذکورہ قبائل آخری زمانے تک اسلام کی مخالفت کرتے رہے اور اس سارے عرصے میں انھوں نے اسلام اور اہل اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر طرح کی کارروائیاں کیں۔ آپ کے ان ارشادات کو پڑھتے ہوئے یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ نہ یہ مذمت ازلی وابدی ہے اور نہ یہ مدحت۔ ان قوموں کی آنے والی نسلیں اپنے قول وعمل کی ذمہ دار ہیں اور ان کے زمانۂ نبوت کے افراد اپنے قول و عمل کے ذمہ دار۔

ان متون میں اونٹوں اور بکریوں کے پالنے کے اثرات کا ذکر بھی ہوا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی نفسیات اپنے ماحول سے اثر قبول کرتی ہے۔ پیشہ، حلقۂ احباب، مصروفیات کی نوعیت اور خاندان وغیرہ انسان کی پسند ناپسند اور فیصلے اور معاملہ کرنے کے انداز کی صورت گری کرتے ہیں۔ اونٹ کی خصلت میں شدت اور سختی نمایاں ہے، اس کی گلہ بانی کرنے والوں کو سختی کرنا پڑتی ہے۔ یہی چیز ان کی عادت ثانیہ بھی بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس بکری نرمی کی خصلت رکھتی ہے، اس کی گلہ بانی نرمی اور محبت کا تقاضا کرتی ہے۔ یہی چیز ان کے پالنے والوں کی عادت میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ اہل یمن کا عمومی پیشہ بکریوں کی گلہ بانی تھا، اس لیے ان کی طرف سے نرمی کا مظاہرہ ہوا اور ربیعہ اور مضر

کا پیشہ اونٹوں کی گلہ بانی تھا، ان کی طرف سے شدت اور سختی کا رویہ سامنے آیا۔ ایک گروہ کی خصلت ان کے لیے ایمان قبول کرنے میں معاون ثابت ہوئی اور دوسرے کی خصلت ایمان کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔ ان روایات کا سبق یہ ہے کہ انسان اپنے ماحول کے اثرات پر متنبہ رہے اور اسے حق کے معاملے میں رکاوٹ نہ بننے دے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آدمی اپنے ماحول کے آگے بالکل بے بس ہے۔ ظاہر ہے، اس کا جواب نفی میں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان لوگوں کی مذمت کے کوئی معنی نہیں ہیں جو اپنے حالات کے تحت کچھ رویے اختیار کر رہے ہوتے ہیں۔ انسان کی قوت ارادی اور شعور ان عوامل پر غالب آنے کی صلاحیت سے کبھی محروم نہیں ہوتا۔ چنانچہ حق کو رد کرنے کا جرم ہمیشہ جرم ہی رہتا ہے۔

متون

اس روایت کے متعدد متون خود امام مسلم رحمہ اللہ نے نقل کر دیے ہیں۔ ان سے اس روایت کے بیش تر اختلافات سامنے آ جاتے ہیں۔ دوسری کتب حدیث میں اس روایت کے یہی متون منقول ہیں۔ ان میں ایسا کوئی اختلاف منقول نہیں ہے جو قابل لحاظ ہو۔

کتابیات

بخاری، رقم ۳۱۲۶، ۳۳۰۷، ۳۳۰۸، ۴۱۲۶، ۴۹۹۷۔ مسلم، رقم ۵۱، ۵۲۔ ترمذی، رقم ۲۲۴۳۔ احمد، رقم ۷۴۹۶، ۷۶۳۹، ۸۸۳۳، ۹۲۷۵، ۹۴۰۱، ۹۴۹۵، ۹۸۹۷، ۱۰۲۸۸، ۱۰۵۸۷، ۱۰۹۹۱، ۱۴۹۵۸، ۱۷۱۰۷، ۲۲۳۹۷۔ ابن حبان، رقم ۵۷۷۴، ۷۲۹۷۔ عبدالرزاق، رقم ۱۹۸۸۵۔ ابویعلیٰ، رقم ۶۵۱۰۔ مسند الشامیین، رقم ۱۰۸۳، ۳۰۳۱۔

معز امجد

مومن اور منکر میں فرق کے بارے میں ایک روایت

روایت کا مضمون

مسند ابو یعلیٰ، رقم ۲۳۴۹ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل ہوا ہے:

عُرَى الْإِسْلَامِ وَقَوَاعِدُ الدِّيْنِ ثَلَاثَةٌ عَلَيْهِنَّ أُسِّسَ الْإِسْلَامُ مَنْ تَرَكَ مِنْهُنَّ وَاحِدَةً فَهُوَ بِهَا كَافِرٌ حَلَالُ الدَّمِ شَهَادَةُ أَنْ لَّا اِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَالصَّلَاةُ الْمَكْتُوْبَةُ وَصَوْمُ رَمَضَانَ ثُمَّ قَالَ بْنُ عَبَّاسٍ تَجِدُهُ كَثِيْرَ الْمَالِ لَا يُزَكِّيْ فَلَا يَزَالُ بِذَاكَ كَافِرًا يَحِلُّ دَمُهُ وَتَجِدُهُ كَثِيْرَ الْمَالِ لَمْ يَحُجَّ فَلَا يَزَالُ بِذَاكَ كَافِرًا وَلَا يَحِلُّ دَمُهُ.

اسلام کے گوشے اور دین کے ستون تین ہیں جن پر اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ جس نے ان میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑا تو وہ اس کی وجہ سے منکر ہے اور اس کا خون جائز ہے۔ (پہلا یہ کہ) اس بات کی شہادت کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، (دوسرا یہ کہ) فرض نمازوں کو ادا کرنا اور (تیسرا یہ کہ) رمضان کے روزے رکھنا۔ پھر ابن عباس نے فرمایا: اگر تم کسی کو بہت مال دار پاؤ، مگر وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے تو وہ اس کی وجہ سے منکر ہے اور اس کا خون جائز ہے۔ اور اگر تم اسے بہت مال دار پاؤ، مگر اس نے حج نہ کیا ہو تو وہ اس وجہ سے منکر تو ہے، مگر اس کا خون جائز نہ ہوگا۔

یہ روایت واضح کرتی ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہر مسلمان پر چند احکام کی پابندی لازم ہے۔ اگر وہ ان پر عمل نہیں کرتا تو وہ مسلمان کے بجائے منکر شمار ہو گا۔ جن احکام کی پابندی ہر مسلمان پر لازم ہے، روایت کی رو سے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اس بات کی شہادت کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

۲۔ نماز کا اہتمام۔

۳۔ رمضان کے روزوں کا اہتمام۔

مزید براں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں روایت ہوا ہے کہ انھوں نے اس فہرست میں درج ذیل دو مزید احکام کا اضافہ کیا ہے:

۱۔ مال دار شخص کا زکوٰۃ ادا کرنا۔

۲۔ مال دار شخص کا حج ادا کرنا۔

روایت میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کی وحدانیت، نماز کے قیام یا روزہ رکھنے سے انکار کرے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے فرمان کی رو سے وہ اگر مال دار ہونے کے باوجود زکوٰۃ دینے سے انکار کر دے تو اس کو قتل کرنا جائز ہو گا۔

مومن اور منکر میں فرق اور منکر کی سزا کے بارے میں قرآن کا حکم

قانون رسالت یعنی رسولوں کی طرف سے اپنے مخاطبین پر اتمام حجت کے بعد ان پر غلبے کے حوالے سے خدائی قانون کا اطلاق کرتے ہوئے قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین میں سے تمام مشرک لازماً ہلاک کیے جائیں گے، الاّ یہ کہ وہ اسلام قبول کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ قرآن مجید میں یہ حکم اس طرح بیان ہوا ہے:

فَاِذَا انۡسَلَخَ الۡاَشۡهُرُ الۡحُرُمُ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ وَخُذُوۡهُمۡ وَاحۡصُرُوۡهُمۡ وَاقۡعُدُوۡا لَهُمۡ كُلَّ مَرۡصَدٍ فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

''سو جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو، ان کو پکڑو، ان کو گھیرو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک لگاؤ۔ پس اگر یہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں

فَخَلُّوا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (التوبہ۹:۵)

تب ان کی جان چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔‘‘

قانون کی نظر میں کسی شخص کو مسلمان قرار دینے کے لیے قرآن نے دو ہی شرائط بیان فرمائی ہیں اور وہ نماز کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ دین کے کسی تیسرے حکم کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے، خواہ وہ کتنی ہی اہمیت کا حامل کیوں نہ ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روایت کی نسبت

زیر بحث روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی گئی ہے اگرچہ اس روایت کا ایک راوی اس بارے میں واضح نہیں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس روایت کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی تھی یا نہیں۔ اس روایت کی سند کو بیان کرتے ہوئے ابن عبدالبر اپنی کتاب ’’الاستذکار‘‘ میں لکھتے ہیں:

حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ مَالِكٍ النُّكْرِيُّ عَنْ أَبِي الْجَوْزَاءِ عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ ـــــ قَالَ حَمَّادٌ وَلَا أَظُنُّهُ إِلَّا رَفَعَهُ ـــــ قَالَ.... (۲۱۸/۳)

’’اس روایت کو حماد ابن زید نے عمر بن مالک النکری سے اور انھوں نے ابی الجوزاء سے اور انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ـــــ حماد کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ اس روایت کی نسبت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے ـــــ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا...‘‘

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس بات پر اطمینان نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس روایت کی نسبت درست ہے۔

روایت پر تبصرہ

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہے کہ یہ روایت اپنے مضمون اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کے پہلو سے قابل اعتماد نہیں ہے۔ اس روایت کو سند کے پہلو سے دیکھیں تو اس کا ایک راوی (حماد ابن زید) اس معاملے میں واضح نہیں ہے کہ یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے یا اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ ظاہر ہے، یہ بات اس روایت کی صحت کو متاثر کرتی ہے۔ دوسری طرف اس روایت کا متن قرآن مجید کے واضح احکامات سے

متصادم ہے۔ روایت کے مطابق جو شخص رمضان کے روزے نہیں رکھتا اور حج کا فریضہ ادا نہیں کرتا وہ بھی نماز اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے شخص ہی کی طرح منکر ہے۔ یہ بات قرآن مجید کے بیان کردہ قانون پر اضافہ ہے جو بہر حال جائز نہیں ہے۔ مزید براں اس روایت کا مضمون کئی ایسی مستند اور مقبول روایات سے بھی متصادم ہے جن کے مطابق اسلام کے ستون تین کے بجائے پانچ ہیں۔

نتیجۂ بحث

زیر بحث روایت کے مذکورہ بالا ضعف کو جان لینے کے بعد یہ باور کرنا خاصا مشکل ہے کہ یہ روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف درست منسوب ہوئی ہے۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ بعض راویوں کی طرف سے روایت کے فہم میں کہیں کوتاہی ہوئی ہے۔

محمد رفیع مفتی

جھوٹی قسم کھانے، خودکشی کرنے، مومن پر لعنت کرنے اور اسے کافر کہنے کا انجام

رُوِیَ[1] عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ حَلَفَ بِمِلَّۃٍ غَیْرِ الْإِسْلَامِ کَاذِبًا مُتَعَمِّدًا[2] فَھُوَ کَمَا قَالَ، إِنْ قَالَ إِنِّیْ یَھُوْدِیٌّ فَھُوَ یَھُوْدِیٌّ وَإِنْ قَالَ إِنِّیْ نَصْرَانِیٌّ فَھُوَ نَصْرَانِیٌّ وَإِنْ قَالَ إِنِّیْ مَجُوْسِیٌّ فَھُوَ مَجُوْسِیٌّ[3] وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَہُ بِشَیْءٍ فِی الدُّنْیَا[4] عُذِّبَ بِہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ[5] فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ وَمَنْ لَّعَنَ مُؤْمِنًا فَھُوَ[6] کَقَتْلِہِ وَمَنْ رَمٰی مُؤْمِنًا بِکُفْرٍ فَھُوَ کَقَتْلِہِ.

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جس نے اسلام کے علاوہ کسی ملت پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائی تو وہ اپنے قول ہی کے مطابق شمار ہوگا۔ اگر اس نے کہا کہ میں (فلاں کام کروں تو مسلمان نہیں، بلکہ) یہودی ہوں گا تو وہ یہودی ہی شمار ہوگا اور اگر کہا کہ میں نصرانی ہوں گا تو وہ نصرانی ہی شمار ہوگا اور اگر کہا کہ میں مجوسی ہوں گا تو وہ مجوسی ہی شمار ہوگا۔ اور جس نے دنیا میں اپنے آپ کو کسی چیز سے قتل کیا تو وہ قیامت کے دن جہنم کی آگ میں اسی چیز کے ذریعے سے عذاب دیا جائے گا، اور

جس نے کسی مومن پر لعنت کی تو یہ بات اسے قتل کر دینے ہی کی مثل ہے، اور جس نے کسی مومن پر کفر کی تہمت لگائی تو یہ بات بھی اسے قتل کر دینے ہی کی مثل ہے۔[1]

ترجمے کے حواشی

۱۔ اس حدیث میں چار باتیں بیان ہوئی ہیں:

پہلی یہ کہ اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر یہ جھوٹی قسم کھاتا ہے کہ اگر اس نے فلاں کام ماضی میں کیا ہو یا وہ مستقبل میں کرے تو وہ مسلمان نہیں، بلکہ یہودی، نصرانی یا مجوسی شمار ہو تو ایسا شخص اپنی جھوٹی قسم کی وجہ سے اپنے اس قسم کھانے کے زمانے میں عنداللہ اپنے قول ہی کے مطابق شمار ہوگا۔ قسم کھانا دراصل، خدا کو اپنے عہد یا اپنی بات پر گواہ ٹھہرانا ہے، خدا پر سچا ایمان رکھنے کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کو کسی جھوٹے عہد یا جھوٹی بات پر لوگوں کے سامنے اپنا گواہ بنائے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا کرتا ہے تو گویا اس کے ہاں خدا خوفی نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں۔

دوسری یہ کہ جس نے اپنے آپ کو کسی چیز سے دنیا میں قتل کیا، اسے قیامت کے دن جہنم کی آگ میں اسی چیز سے عذاب دیا جائے گا۔

اس دنیا میں انسان کی حیثیت خدا کے مملوک بندے کی ہے۔ لہٰذا، نہ وہ اپنے جسم اور اپنی جان کا حقیقی مالک ہے اور نہ اسے ان پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ جسم اور جان بھی دوسری بہت سی چیزوں کی طرح اللہ کی دی ہوئی وہ امانتیں ہیں، جن کے بارے میں قیامت کے دن اس سے سوال ہوگا۔ جس طرح کسی بھی امانت میں خیانت ممنوع ہے، اسی طرح اللہ کی دی ہوئی ان امانتوں میں خیانت کرنا یا انھیں سرے سے ضائع کر دینا بھی ممنوع ہے۔ چنانچہ انسان کے لیے اپنی جان بھی ایک محترم شے ہے۔ وہ جس طرح کسی دوسرے شخص کو قتل نہیں کر سکتا اسی طرح اپنے آپ کو بھی قتل نہیں کر سکتا۔ اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو قتل کرے گا تو اسے اس کی یہ سزا ملے گی کہ وہ جہنم کی آگ میں اپنے آپ کو اسی طریقے سے بار بار قتل کرتا رہے گا، جس طرح اس نے دنیا میں خود کو قتل کیا ہوگا۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

تیسری یہ کہ جس نے کسی مومن پر لعنت کی تو اس کی سنگینی اسے قتل کر دینے کی مثل ہے۔ کسی پر لعنت کرنے کا مطلب اس کے لیے خدا کی رحمت سے دوری کی بددعا کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انتہائی بددعا ہے۔ اس حدیث میں

اس کی شناعت واضح کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کسی مومن کے لیے یہ بد دعا اتنی ہی ناگوار ہے، جتنا کہ اسے قتل کر دینا، چنانچہ خدا اس شخص کے ساتھ جو مومن کو یہ بد دعا دے گا، اس کی شناعت کے مطابق معاملہ کرے گا۔

چوتھی یہ کہ جس نے کسی مومن پر کفر کی تہمت لگائی تو یہ بات بھی اسے قتل کر دینے ہی کی مثل ہے۔

سچے صاحب ایمان کے لیے ایمان اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کو سلامت رکھنے کے لیے اپنی جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ایسے شخص کو اگر کوئی آدمی کافر قرار دے یا اسے کفر کے ساتھ منسوب کرے تو اس کے اس قول سے گو اس کے ایمان کی نفی نہیں ہو جاتی، لیکن اس کے لیے اپنے ساتھ کفر کی نسبت اتنی ہی ناگوار ہوتی ہے جتنا کہ کسی شخص کا اس کو قتل کر دینا۔ چنانچہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس تہمت کے مجرموں کے ساتھ ان کے جرم کی شناعت کے مطابق ہی معاملہ کرے گا۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ بخاری کی روایت، رقم ۵۷۵۴ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ مضمون یا اس کے بعض حصے حسب ذیل ۲۵ مقامات پر نقل ہوئے ہیں۔

بخاری، رقم ۵۷۰۰، ۱۲۹۷، ۶۲۷۶؛ مسلم، رقم ۱۱۰(۳)؛ ابوداؤد، رقم ۳۲۵۷؛ ترمذی، رقم ۱۵۴۳؛ نسائی، رقم ۳۷۷۰، ۳۷۷۱، ۳۸۱۳؛ ابن ماجہ، رقم ۲۰۹۸؛ احمد بن حنبل، رقم ۱۶۴۳۲، ۱۶۴۳۳، ۱۶۴۳۴، ۱۶۴۳۶، ۱۶۴۳۷، ۱۶۴۳۸، ۱۶۴۳۹؛ ابن حبان، رقم ۴۳۶۶، ۴۳۶۷؛ بیہقی، رقم ۱۵۶۵۴، ۱۹۶۱۹؛ ابو یعلیٰ، رقم ۱۵۳۵، ۲۰۰۶۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۷۰۰ ہی میں 'وَلَيْسَ عَلَى بْنِ آدَمَ نَذْرٌ فِيمَا لَا يَمْلِكُ' (انسان پر اس چیز میں نذر نہیں ہے جس کا وہ مالک ہی نہ ہو) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۱۰ میں 'وَلَيْسَ عَلَى رَجُلٍ نَذْرٌ فِي شَيْءٍ لَّا يَمْلِكُهُ' (انسان پر اس چیز میں نذر نہیں ہے جس کا وہ مالک ہی نہ ہو) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۱۰ ہی کی دوسری سند میں 'وَلَيْسَ عَلَى رَجُلٍ نَذْرٌ فِيمَا لَا يَمْلِكُ' (انسان پر اس چیز میں نذر نہیں ہے جس کا وہ مالک ہی نہ ہو) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۵۷ میں 'وَلَيْسَ عَلَى رَجُلٍ نَذْرٌ فِيمَا لَا يَمْلِكُهُ' (انسان پر اس چیز میں نذر نہیں ہے جس کا وہ مالک ہی نہ ہو) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۶۴۳۲ میں 'وَلَیْسَ عَلٰی رَجُلٍ مُسْلِمٍ نَذْرٌ فِیْمَا لَا یَمْلِكُ' (کسی مسلمان پر اس چیز میں نذر نہیں ہے جس کا وہ مالک ہی نہ ہو) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۱۹ میں 'وَلَیْسَ عَلَی الْمُؤْمِنِ نَذْرٌ فِیْمَا لَا یَمْلِكُ' (کسی مومن پر اس چیز میں نذر نہیں ہے جس کا وہ مالک ہی نہ ہو) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۷۰۰ میں 'بِمِلَّةٍ' (ملت پر) کے بجائے 'عَلٰی مِلَّةٍ' (ملت پر) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۷۵۴ میں 'مَنْ لَّعَنَ مُؤْمِنًا فَهُوَ' (جس نے کسی مومن پر لعنت کی تو یہ چیز) کے بجائے 'لَعْنُ الْمُؤْمِنِ' (مومن پر لعنت کرنا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۶۲۷۶ میں 'بِمِلَةِ غَیْرِ الْإِسْلَامِ' (اسلام کے علاوہ کسی ملت پر) کے بجائے 'بِغَیْرِ مِلَّةِ الْإِسْلَامِ' (ملت اسلام کے علاوہ) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۱۰ میں 'مَنْ حَلَفَ' (جس نے قسم اٹھائی) کے بجائے 'مَنْ حَلَفَ عَلٰی یَمِیْنٍ' (جس نے کوئی قسم اٹھائی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۱۰ کی دوسری سند میں 'وَمَنِ ادَّعٰی دَعْوٰی کَاذِبَةً لِیَتَکَثَّرَ بِهَا لَمْ یَزِدْهُ اللّٰهُ إِلَّا قِلَّةً وَمَنْ حَلَفَ عَلٰی یَمِیْنِ صَبْرٍ فَاجِرَةٍ' (جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لیے جھوٹا دعویٰ کرے گا، اللہ اسے قلت ہی میں بڑھائے گا، اور جس نے حاکم کے سامنے مسلمان کا مال دبانے کے لیے جھوٹی قسم کھائی) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۱۰ کی تیسری سند میں 'غَیْرِ' (علاوہ) کے بجائے 'سِوَی' (سوا) کے الفاظ اور 'وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِشَیْءٍ فِی الدُّنْیَا عُذِّبَ بِهِ' (جس نے دنیا میں اپنے آپ کو کسی چیز سے قتل کیا، وہ اسی چیز کے ذریعے سے عذاب دیا جائے گا) کے بجائے 'مَنْ ذَبَحَ نَفْسَهُ بِشَیْءٍ ذُبِحَ بِهِ' (جس نے اپنے آپ کو کسی چیز سے ذبح کر دیا، وہ اسی چیز کے ذریعے سے ذبح کیا جائے گا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۵۷ میں 'مَنْ حَلَفَ بِمِلَّةٍ غَیْرِ الْإِسْلَامِ' (جس نے اسلام کے علاوہ کسی ملت پر قسم کھائی) کے بجائے 'مَنْ حَلَفَ بِمِلَّةٍ غَیْرِ مِلَّةِ الْإِسْلَامِ' (جس نے ملت اسلام کے علاوہ کسی ملت پر قسم کھائی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۷۷۱ میں 'یَوْمَ الْقِیَامَةِ' (قیامت کے دن) کے بجائے 'فِی الْآخِرَةِ' (آخرت میں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۶۴۳۳ میں 'عُذِّبَ بِهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ' (وہ قیامت کے دن جہنم کی آگ میں اسی چیز سے عذاب دیا جائے گا) کے بجائے 'عَذَّبَهُ اللّٰهُ بِهِ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ' (اللہ جہنم کی آگ میں اسی چیز کے ذریعے سے اسے عذاب دے گا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۶۴۳۷ میں 'مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِشَیْءٍ فِی الدُّنْیَا عُذِّبَ بِهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ' (جس نے اپنے آپ کو کسی چیز سے دنیا میں قتل کیا، وہ قیامت کے دن اسی چیز کے ذریعے سے عذاب دیا جائے گا) کے بجائے 'وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِشَیْءٍ أَوْ ذَبَحَ ذَبَحَهُ اللّٰهُ بِهِ' (جس نے اپنے آپ کو کسی چیز سے قتل کیا یا ذبح کیا، اللہ اسی چیز کے ذریعے سے اسے ذبح کرے گا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۶۴۳۸ میں 'مَنْ رَمٰی مُؤْمِنًا بِکُفْرٍ' (جس نے کسی مومن پر کفر کی تہمت لگائی) کے بجائے 'مَنْ شَهِدَ عَلٰی مُسْلِمٍ أَوْ قَالَ مُؤْمِنًا بِکُفْرٍ' (جس نے کسی مسلمان کے یا کہا مومن کے کفر کی گواہی دی) کے الفاظ اور 'فَهُوَ کَمَا قَالَ' (تو وہ اسی طرح ہوگا جیسے اس نے کہا) کے بجائے 'فَهُوَ کَمَا حَلَفَ' (تو وہی ہوگا جس کی اس نے قسم کھائی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۶۴۳۹ میں 'عُذِّبَ بِهِ یَوْمِ الْقِیَامَةِ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ' (وہ قیامت کے دن جہنم کی آگ میں اسی چیز سے عذاب دیا جائے گا) کے بجائے 'عَذَّبَهُ اللّٰهُ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ' (اللہ جہنم کی آگ میں اسے عذاب دے گا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۲۔ 'مُتَعَمِّدًا' کے الفاظ بخاری، رقم ۱۲۹۷ سے لیے گئے ہیں۔

۳۔ 'إِنْ قَالَ إِنِّیْ یَهُوْدِیٌّ فَهُوَ یَهُوْدِیٌّ وَإِنْ قَالَ إِنِّیْ نَصْرَانِیٌّ فَهُوَ نَصْرَانِیٌّ وَإِنْ قَالَ إِنِّیْ مَجُوْسِیٌّ فَهُوَ مَجُوْسِیٌّ' کے الفاظ ابویعلیٰ، رقم ۶۰۰۶ سے لیے گئے ہیں۔

۴۔ 'فِی الدُّنْیَا' کے الفاظ بخاری، رقم ۵۷۰۰ سے لیے گئے ہیں۔

۵۔ 'یَوْمَ الْقِیَامَةِ' کے الفاظ بھی بخاری، رقم ۵۷۰۰ سے لیے گئے ہیں۔

۶۔ 'وَمَنْ لَّعَنَ مُؤْمِنًا فَهُوَ' کے الفاظ بھی بخاری، رقم ۵۷۰۰ سے لیے گئے ہیں۔

ساجد حمید

مردہ مچھلی کا گوشت

عَنْ جَابِرٍ قَالَ: بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ [اِلٰى سَيْفِ الْبَحْرِ[1]]، نَتَلَقّٰى عِيرًا لِقُرَيْشٍ، وَأَمَّرَ عَلَيْنَا أَبَا عُبَيْدَةَ، وَزَوَّدَنَا جِرَابًا مِّنْ تَمْرٍ لَمْ يَجِدْ لَنَا غَيْرَهُ. [وَنَحْنُ ثَلَاثُمِائَةٍ[2]،] [وَأَنَا فِيهِمْ[3]،] [نَحْمِلُ زَادَنَا عَلٰى رِقَابِنَا[4].]

قَالَ: فَخَرَجْنَا، حَتّٰى إِذَا كُنَّا فِيْ بَعْضِ الطَّرِيْقِ فَنِيَ الزَّادُ، فَأَمَرَ أَبُوْ عُبَيْدَةَ بِأَزْوَادِ ذٰلِكَ الْجَيْشِ، فَجُمِعَ ذٰلِكَ كُلُّهُ فَكَانَ مِزْوَدَيْ تَمْرٍ[5]. [فَكَانَ يُقَوِّتُنَا كُلَّ يَوْمٍ قَلِيْلاً قَلِيْلاً، حَتّٰى فَنِيَ وَلَمْ يُصِبْنَا إِلَّا تَمْرَةٌ تَمْرَةٌ[6]،] قُلْتُ: كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ بِهَا؟ قَالَ: نَمَصُّهَا كَمَا يَمَصُّ الصَّبِيُّ ثُمَّ نَشْرَبُ عَلَيْهَا الْمَاءَ فَيَكْفِيْنَا يَوْمَنَا إِلَى اللَّيْلِ[7].[وَجَدْنَا فَقْدَهُ فَجَعَلَ يَجِيْءُ الرَّجُلُ بِالشَّيْءِ[8]].

قَالَ: وَانْطَلَقْنَا [حَتّٰى انْتَهَيْنَا اِلَى الْبَحْرِ[8]] [فَأَقَمْنَا بِالسَّاحِلِ نِصْفَ شَهْرٍ فَأَصَابَنَا جُوْعٌ شَدِيْدٌ حَتّٰى أَكَلْنَا الْخَبَطَ[9]] وَكُنَّا نَضْرِبُ بِعِصِيِّنَا الْخَبَطَ

[وَنَسَفُّهُ][١٠] ثُمَّ نَبُلُّهُ بِالْمَاءِ فَنَأْكُلُهُ [فَسُمِّيَ جَيْشُ الْخَبَطِ][١١] فَرُفِعَ لَنَا عَلٰى سَاحِلِ الْبَحْرِ كَهَيْئَةِ الْكَثِيْبِ الضَّخْمِ فَأَتَيْنَاهُ فَإِذَا هِيَ دَابَّةٌ تُدْعَى الْعَنْبَرُ. [لَمْ يُرَ مِثْلُهُ][١٢] قَالَ: قَالَ اَبُوْ عُبَيْدَةَ: مَيْتَةٌ، ثُمَّ قَالَ: لَا، بَلْ نَحْنُ رُسُلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدِ اضْطُرِرْتُمْ فَكُلُوْا. [فَأَنَاخَ عَلَيْهِ الْعَسْكَرُ][١٣]

قَالَ: فَأَقَمْنَا عَلَيْهِ شَهْرًا[١٤] وَنَحْنُ ثَلَاثُ مِائَةٍ حَتّٰى سَمِنَّا قَالَ وَلَقَدْ رَأَيْتُنَا نَغْتَرِفُ مِنْ وَقْبِ عَيْنِهِ بِالْقِلَالِ الدُّهْنَ وَنَقْتَطِعُ مِنْهُ الْقِدَرَ كَالثَّوْرِ أَوْ كَقَدْرِ الثَّوْرِ فَلَقَدْ أَخَذَ مِنَّا أَبُوْ عُبَيْدَةَ ثَلَاثَةَ عَشَرَ رَجُلًا فَأَقْعَدَهُمْ فِيْ وَقْبِ عَيْنِهِ وَأَخَذَ ضِلَعًا مِنْ أَضْلَاعِهِ فَأَقَامَهَا ثُمَّ رَحَلَ أَعْظَمَ بَعِيْرٍ مَعَنَا فَمَرَّ مِنْ تَحْتِهَا وَتَزَوَّدْنَا مِنْ لَحْمِهِ وَشَائِقَ فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ أَتَيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرْنَا ذٰلِكَ لَهُ. فَقَالَ: هُوَ رِزْقٌ أَخْرَجَهُ اللّٰهُ لَكُمْ فَهَلْ مَعَكُمْ مِنْ لَحْمِهِ شَيْءٌ فَتُطْعِمُوْنَا قَالَ فَأَرْسَلْنَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُ فَأَكَلَهُ. (مسلم، رقم ۱۹۳۵)

حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سیف البحر کی طرف، قریش کے ایک قافلے کی جاسوسی کے لیے روانہ فرمایا اور ابوعبیدہ بن الجراح کو ہمارا سالار مقرر کیا۔ کھجوروں کی ایک بوری بطور زادراہ کے ساتھ دی، اس لیے کہ ہمیں دینے کے لیے اور کچھ میسر نہیں تھا جبکہ ہماری تعداد تین سو تھی۔ میں بھی اس قافلہ میں تھا۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اپنے سروں پر اٹھایا ہوا تھا۔

انھوں نے کہا: ہم چل پڑے اور راستے ہی میں زادراہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ابوعبیدہ نے کہا کہ

لشکر کے لوگ اپنا ذاتی زادسفر جمع کرادیں۔ زادراہ سارا اکٹھا کیا گیا تو وہ دو بوریوں کے برابر تھا۔ چنانچہ ابوعبیدہ ہمیں روز تھوڑا تھوڑا زادراہ دیتے تھے، یہاں تک کہ یہ سامان بھی ختم ہو گیا اور ہمیں روزانہ بس ایک ایک کھجور کھانے کو ملتی۔ (ایک سامع نے کہا:) میں نے (حضرتِ جابر سے) کہا: آپ اتنی کم غذا پر کیسے گزارا کرتے تھے؟ انھوں نے کہا: ہم اس کھجور کو ایسے ہی چوستے جیسے کوئی بچہ چوستا ہے۔ پھر اس پر پانی پی لیتے تو یہ ایک دن کے لیے رات تک ہمارے لیے کفایت کرتی تھی۔

پھر انھوں نے کہا کہ ہم چلتے رہے، یہاں تک کہ سمندر کے کنارے جا پہنچے، ہم نے وہاں ساحل پر نصف ماہ تک قیام کیا، چنانچہ ہمیں شدید بھوک کا سامنا رہا، یہاں تک کہ ہم نے درختوں کے پتے جھاڑ جھاڑ کر کھائے۔ وہ اس طرح کہ ہم لاٹھیوں سے پتوں کو مارتے پھر ان کی مٹی جھاڑ کر انھیں پانی میں بھگو کر کھا لیتے۔ اس عمل کی وجہ سے اس لشکر کا نام بعد میں جیش الخبط (یعنی پتے کھانے والا لشکر پڑ گیا)۔ پھر ہمارے لیے ساحل سمندر پر ایک بڑے سے ڈھیر کی صورت میں کوئی چیز ظاہر کی گئی۔ تو ہم اس کے پاس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ کوئی سمندری جانور ہے جسے عنبر[2] کہتے ہیں، ایسی مچھلی پہلے نہ دیکھی تھی۔ (راوی نے) کہا کہ ابوعبیدہ نے پہلے تو یہ رائے قائم کی کہ یہ مردار ہے (اس لیے اسے مت کھاؤ)۔ پھر اس رائے تک پہنچے کہ نہیں، بلکہ صورت حال یہ ہے کہ (ہم مجبور ہیں اور) اللہ کے رسول کے بھیجے ہوئے ہیں، اور راہ خدا میں نکلے ہیں، اس لیے (ہمیں فرمایا) چونکہ تم حالت مجبوری میں ہو، اس لیے تم یہ کھا سکتے ہو[3]۔ سو اس مچھلی کے گوشت پر (انحصار کرتے ہوئے) لشکر کو وہیں پڑاؤ کرایا۔

انھوں نے بتایا: پھر ہم اس مچھلی کے سہارے ایک ماہ تک وہاں قیام پذیر رہے۔ ہماری تعداد تین سو تھی۔ (ہم اسے کھاتے رہے) حتی کہ ہماری صحتیں اچھی ہو گئیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ تم ہمیں دیکھتے کہ ہم اس کی آنکھ کے سوراخ میں سے ایک لکڑی کے ذریعے سے چکنائی سی (بطور گھی کے) نکال لیتے اور ایک بیل کے بقدر اس سے گوشت اتار لیتے تھے۔ ابوعبیدہ نے ہم میں سے تیرہ لوگوں کو لیا اور انھیں اس کی آنکھ کی کھوہ میں بٹھایا۔ اسی طرح اس کی پسلی کا کانٹا سا لیا اور اسے زمین میں نصب کیا تو ہم میں

سے سب سے اونچے اونٹ سوار کو اونٹ پر سوار کرایا۔ تو وہ اس کانٹے کے نیچے سے آرام سے گزر گیا[4]۔

ہم نے (واپسی پر) اس کے کچھ خشک پارچہ جات کو زادراہ کے طور پر ہمراہ رکھ لیا۔ جب ہم مدینہ واپس پہنچے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے اس (آبی جانور عنبر) کا ذکر کیا۔ (آپ نے سارا ماجرا سن کر) فرمایا: یہ رزق تھا، جو اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لیے نکالا۔ کیا تم لوگوں کے پاس ابھی اس کا کچھ گوشت ہے، (اگر ہے تو) ہمیں بھی دو۔ صحابی کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کو یہ گوشت بھیجا اور آپ نے تناول فرمایا[5]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ ہم نے یہاں ترجمہ میں جاسوسی کا لفظ استعمال کیا ہے، جبکہ متن میں 'نَتَلَقّٰی' ہے جس کے معنی مڈ بھیڑ یا ملنے کے ہوں گے، دراصل بہت سی روایتوں میں 'نَرصُدُ' کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی ٹوہ میں رہنے کے ہیں۔ مثلاً دیکھیے بخاری، رقم ۴۱۰۳۔

۲۔ عنبر ایک بڑی مچھلی ہے، جسے انگریزی میں Amberwhale کہتے ہیں۔ غالباً اس نام کا ابتدائی حصہ 'amber' بھی عربی زبان کے لفظ 'عنبر' ہی سے انگریزی میں آیا ہے۔ عنبر ایک موادسا ہے جو اس مچھلی سے نکلتا ہے۔

۳۔ ابوعبیدہ اور ان کے ہمراہ دیگر صحابہ رضوان اللہ اجمعین 'میتة' کے اس استثنا سے واقف نہ تھے، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا انھوں اضطرار کے اصول پر اس 'میتة' کو کھانے کا اجتہاد کیا۔ آپ نے 'میتة' میں سے مردار مچھلی کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ آپ نے یہ استثنا ان الفاظ میں بیان کیا ہے: 'أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ: الْحُوتُ وَالْجَرَادُ' (ہمارے لیے دو 'میتة' [مردار] حلال ہیں: ایک مچھلی دوسرے ٹڈی (ابن ماجہ، رقم ۳۲۱۸)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب جب 'میتة' بولتے ہیں تو اس لفظ کے عموم میں مچھلی شامل نہیں ہوتی۔ یہ زبانوں کا عام اصول ہے کہ حقیقت میں ایک جیسا ہونے کے باوجود دو چیزوں کے لیے الفاظ مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جب ہم اردو میں یہ کہتے ہیں کہ 'میں گوشت کھا کر آیا ہوں تو باوجود گوشت ہونے کے مرغی اور مچھلی اس میں شامل نہیں ہوتے۔ مچھلی اور ٹڈی کے 'میتة' ہونے کے باوجود حلت کی وجہ ہم احادیث کی پچھلی توضیحات میں عرض کر چکے ہیں کہ ان دونوں میں سرخ خون نہیں ہوتا، جسے دم مسفوح کا نام دے کر حرام کیا گیا ہے۔

۴۔اس پیراگراف میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ محض اس مچھلی کے حجم اور کمیت کو بیان کرنے کے لیے اور جاننے کے لیے کیا گیا۔

۵۔یعنی انھوں نے اس 'میتة' کو کھانے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس کی تصدیق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہو گئی۔ البتہ چونکہ آپ اسے مجبوری کی وجہ سے نہیں، بلکہ 'میتة' کے تحت نہ ہونے کی وجہ سے حلال سمجھتے تھے، اس لیے آپ نے مدینہ میں ہوتے ہوئے اور کسی مجبوری کے بغیر بھی اس مچھلی کا گوشت کھایا۔

متن کے حواشی

۱۔ یہ اضافہ صحیح مسلم، رقم ۱۹۳۵ کے تحت دوسری روایت سے کیا گیا ہے۔

۲۔ یہ اضافہ سنن الکبریٰ، رقم ۴۸۹۳ سے کیا گیا ہے۔

۳۔ یہ اضافہ موطا امام مالک، رقم ۱۶۶۲ سے کیا گیا ہے۔

۴۔ یہ اضافہ سنن الکبریٰ، رقم ۴۸۹۳ سے کیا گیا ہے۔

۵۔ یہ اضافہ موطا امام مالک، رقم ۱۶۶۲ سے کیا گیا ہے۔اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زاد سفر راستے ہی میں ختم ہو گیا تھا اور کچھ سے معلوم ہوتا ہے کہ ساحل سمندر پر نصف ماہ قیام کے دوران میں ختم ہوا۔جیسا کہ صحیح مسلم، رقم ۱۹۳۵ کے تحت آنے والی ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں: 'فَأَقَمْنَا بِالسَّاحِلِ نِصْفَ شَهْرٍ فَأَصَابَنَا جُوْعٌ شَدِيْدٌ...' (پھر ہم ساحل پر نصف ماہ تک مقیم رہے تو ہمیں شدید بھوک نے آلیا...)

کچھ روایتوں سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ پہلے دن ہی سے زاد سفر تھوڑا ہونے کے سبب سے ایک ایک کھجور ملتی تھی مثلاً دیکھیے: مسلم، رقم ۱۹۳۵۔ 'بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَمَّرَ عَلَيْنَا أَبَا عُبَيْدَةَ نَتَلَقّٰى عِيْرًا لِقُرَيْشٍ وَزَوَّدَنَا جِرَابًا مِّنْ تَمْرٍ لَمْ يَجِدْ لَنَا غَيْرَهُ فَكَانَ أَبُوْ عُبَيْدَةَ يُعْطِيْنَا تَمْرَةً تَمْرَةً...' ''ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ میں بھیجا، اور ہمارے اوپر ابوعبیدہ کو سالار مقرر کیا کہ ہم قریش کے قافلے پر نگاہ رکھیں، ہمیں اس کے لیے ایک بوری کھجور کی بطور زادراہ کے دی، اس سے زیادہ ہمیں دینے کے لیے ان کے پاس نہیں تھا۔چنانچہ ابوعبیدہ ہمیں ایک ایک کھجور دیتے تھے۔''

۶۔ یہ اضافہ صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۶۲ سے کیا گیا ہے۔

روزانہ ایک ایک کھجور ملنے کے اس تذکرہ کے بعد جو سوال جواب نقل ہوئے ہیں کہ ایک آدمی کی ایک کھجور پر کیسے

گزر رہوتی تھی؟اس کے ضمن میں ایک جواب یہ بھی ہے: 'لَقَدْ وَجَدْنَا فَقْدَهَا حِيْنَ فَقَدْنَاهَا' (ترمذی، رقم ۲۱۷۵) ''ہم نے جب کھجور کو ختم ہوتے ہوئے دیکھا تو یہ خیال کیا کہ کہیں بالکل ہی ختم نہ ہو جائے''۔ یعنی کفایت کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا، ہماری پریشانی یہ تھی کہ کہیں سب کچھ ہی ختم نہ ہو جائے اور حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے منہ میں رکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہے۔ مسند احمد ۱۵۷۳۰ میں یہ جواب زیادہ واضح الفاظ میں رقم ہوا ہے: 'قَالَ لَا تَقُلْ ذٰلِكَ يَا بُنَيَّ، فَبَعْدَ أَنْ فَقَدْنَاهَا، فَاخْتَلَلْنَا اِلَيْهَا' ''میرے بچے ایسا مت کہو، اس لیے کہ جب زادراہ ختم ہونے کو ہوا تو ہم بس ایسا کرنے پر مجبور تھے۔''

۷۔ یہ اضافہ صحیح مسلم، رقم ۱۹۳۵ اور مسند احمد، رقم ۱۴۳۷۷ سے کیا گیا ہے۔

۸۔ یہ اضافہ موطا امام مالک، رقم ۱۶۶۲ سے کیا گیا ہے۔

۹۔ یہ اضافہ بھی مسلم کی روایت ۱۹۳۵ کے تحت ایک روایت سے کیا گیا ہے۔ مسلم کی اسی رقم کے تحت ایک روایت میں یہ ہے کہ پتے کھانے کا عمل ساحل پر قیام کے دوران میں ہوا اور دوسری میں ہے کہ راستے میں ہوا۔

۱۰۔ یہ اضافہ النسائی، رقم ۴۳۵۴ سے کیا گیا ہے۔

۱۱۔ یہ اضافہ صحیح بخاری، رقم ۴۱۰۳ سے کیا گیا ہے۔

۱۲۔ یہ اضافہ بخاری، رقم ۵۱۷۴ سے کیا گیا ہے۔

۱۳۔ یہ اضافہ سنن بیہقی الکبریٰ، رقم ۱۸۷۴۳ سے کیا گیا ہے۔

۱۴۔ ایک اور روایت (ابی یعلیٰ، رقم ۱۷۸۶) میں ۲۵ دن کا ذکر ہے، اس عرصہ کی تائید ابوداؤد کی روایت ۳۸۴۰ سے بھی ہوتی ہے جس کے الفاظ ہیں: 'فَأَقَمْنَا عَلَيْهِ شَهْرًا'، (ہم نے اس پر ایک ماہ کا وقت گزارا)۔ بعض روایتوں میں دنوں کی تعداد کم آئی ہے، جیسے بخاری، رقم ۲۸۲۱، ترمذی، رقم ۲۴۷۵، النسائی، رقم ۴۳۵۱، ابن ماجہ، رقم ۴۱۵۹، السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۶۳ میں ہے کہ اٹھارہ دن۔ اس کے الفاظ یوں ہیں: 'فَأَكَلْنَا مِنْهُ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ يَوْمًا' (تو اس سے ہم اٹھارہ دن تک کھاتے رہے)۔ بخاری، رقم ۴۱۰۳، ۴۱۰۴، ۵۱۷۴، مسند احمد، رقم ۱۴۳۵۴، ۱۴۳۵۵، ابن حبان، رقم ۵۲۵۹، السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۶۴، البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۸۷۳۸، ۱۸۷۴۰، ابی یعلیٰ، رقم ۱۹۵۵، مسند ابی الجعد، رقم ۱۲۴۲ سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے، اس میں 'نِصْفَ شَهْرٍ' آدھا مہینا کے الفاظ آئے ہیں۔

بخاری کی ایک روایت میں ایک صاحب کے اونٹوں کے ذبح کرنے کا ذکر بھی ہے۔ وہ روزانہ تین اونٹ ذبح کرتے تھے۔ کئی دن تک ایسا کرنے کے بعد ان کو روک دیا گیا:

قَالَ جَابِرٌ وَكَانَ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ نَحَرَ ثَلَاثَ جَزَائِرَ ثُمَّ نَحَرَ ثَلَاثَ جَزَائِرَ ثُمَّ نَحَرَ ثَلَاثَ جَزَائِرَ ثُمَّ إِنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ نَهَاهُ وَكَانَ عَمْرٌو يَقُوْلُ أَخْبَرَنَا أَبُوْ صَالِحٍ أَنَّ قَيْسَ بْنَ سَعْدٍ قَالَ لِأَبِيْهِ كُنْتُ فِي الْجَيْشِ فَجَاعُوْا قَالَ انْحَرْ قَالَ نَحَرْتُ قَالَ ثُمَّ جَاعُوْا قُلْتُ انْحَرْ قَالَ نَحَرْتُ قَالَ ثُمَّ جَاعُوْا قَالَ انْحَرْ قَالَ نَحَرْتُ ثُمَّ جَاعُوْا قَالَ انْحَرْ قَالَ نُهِيْتُ.

(بخاری، رقم ۴۱۰۳)

''حضرت جابر کہتے ہیں کہ لشکریوں میں سے ایک آدمی نے تین اونٹ ذبح کیے، پھر دوسرے دن تین ذبح کیے، پھر تیسرے دن بھی کیے، مگر (چوتھے دن) ابوعبیدہ نے اسے روک دیا۔ (اسی طرح کی بات وہ ہے) جو عمرو نے بیان کی کہ ہمیں ابوصالح نے خبر دی کہ قیس بن سعد نے اپنے ابا کو بتایا کہ میں بھی لشکر کے ساتھ تھا تو جب لوگوں کو بھوک نے ستایا تو انھوں نے (اسی آدمی سے) کہا (جو مذکورہ تین تین اونٹ ذبح کرتا تھا کہ) تم اونٹ ذبح کرو۔ تو اس آدمی نے کہا: میں نے کر دیے۔ پھر بھوک نے ستایا تو انھوں نے پھر کہا کہ ذبح کرو۔ اس آدمی نے کہا: میں نے ذبح کر دیے۔ پھر بھوک کا وہی معاملہ ہوا۔ تو انھوں نے پھر کہا کہ ذبح کرو۔ تو اس آدمی نے کہا: جی کر دیے پھر بھوک کا معاملہ ہوا۔ تو انھوں نے پھر کہا کہ ذبح کرو۔ تو اس نے عرض کی کہ میں روک دیا گیا ہوں۔''

اگرچہ روایت کا یہ ٹکڑا مچھلی کے بعد ذکر کیا گیا ہے، مگر بخاری کی اس روایت سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ کب کی بات ہے، مچھلی ملنے سے پہلے یا بعد کی۔ اگر مچھلی کے بعد مانیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر واپسی پر اسی مچھلی کے زادراہ بنانے کا قصہ کیا ہوا۔ اسی طرح یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ اونٹ کہاں سے آئے؟ اس لیے کہ قصہ کے آغاز ہی میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم نے اپنا زادراہ اپنے سروں پر اٹھایا ہوا تھا۔ بہرحال یہ اس قصے کا اہم حصہ ہے کہ اس لشکر کے پاس کچھ اونٹ بھی تھے۔ مسند احمد، رقم ۱۴۳۵۴ میں بھی یہ اسی محل یعنی مچھلی کے واقعہ کے بعد بیان ہوا ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اسے عنبر کے ملنے سے پہلے مانا جائے۔

خالد مسعود

قریش کی پریشانی اور مسلمانوں پر سختی

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

مسلمانوں پر تشدد کا دور

قریش کے اکابر نے دیکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام پیش کر رہے ہیں وہ بے حد متاثر کرنے والا ہے، لسانی طور پر پرکشش ہے اور اس میں عقل کے لیے بھی اپیل ہے۔ یہ کلام نت نئے تقاضے اور مطالبے سامنے لا رہا ہے اور اب اس نے مشرکانہ نظام زندگی کی بنیادوں پر تیشہ چلانا شروع کر دیا ہے۔ چونکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی تعلیم کو قبول کر رہے تھے، اس لیے انھیں اپنے خلاف عام بغاوت پیدا ہو جانے کا خطرہ محسوس ہوا۔ اس کو روکنے کی فوری تدبیر یہی اختیار کی جا سکتی تھی کہ اسلام قبول کرنے والوں پر سختی کر کے ان کے لیے زندگی گزارنا اجیرن کر دیا جائے۔ اس میں بڑی رکاوٹ قبائلی نظام تھا جس میں کوئی شخص کسی دوسرے خاندان کے فرد پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ ہر خاندان اپنے افراد پر خود ہی ہاتھ ڈالے۔ اس میں بھی پہلا ہدف غلاموں اور لونڈیوں کو بنایا گیا۔ سیرت کی کتابوں میں یاسر، ان کی بیوی سمیہ، عمار بن یاسر، بلال، خباب بن ارت، عامر بن فہیرہ، ابوفکیہہ، لبینہ، زنیرہ رضوان اللہ علیہم پر تشدد کے واقعات پڑھیے تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کو بھوکے پیاسے رکھنا، دھوپ میں گھنٹوں کھڑا رہنے پر مجبور کرنا، گرم ریت پر لٹانا، زدوکوب کرنا ایک معمول کی کارروائی تھی۔ لیکن دلوں میں ایمان کی جو شمع روشن ہو چکی تھی، وہ اس ظلم سے بجھنے نہیں پائی۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ

سمیہ رضی اللہ عنہا نے جام شہادت نوش کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے متعدد غلاموں کو ان کے آقاؤں سے خرید کر آزاد کر کے ان کو ظلم وستم سے نجات دلائی اور اس میں اپنے والد ابوقحافہ کی ناراضی مول لی۔

سابقون اولون کی عمروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ تر نوجوان طبقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر ہوا۔ بعثت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی عمر چالیس برس تھی۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ سے تین سال چھوٹے تھے، لیکن مسلمانوں کے بڑے بوڑھے کہلاتے تھے۔ گویا باقی مسلمانوں کی عمریں ان سے کم تھیں۔ زیادہ قرشی نوجوان بیس یا تیس کے پیٹے میں تھے۔ اکابرین قریش نے جب سربراہان خاندان کو یہ ہدایت کی کہ وہ اپنے ان نوجوانوں کو قابو میں لائیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دے رہے ہیں تو ظلم وتشدد کے دھارے کا رخ ان نوجوانوں کی طرف بھی مڑا۔ تاریخ میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ، خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ وغیرہ کے نام محفوظ ہیں۔ ان کو اتنی ایذائیں دی گئیں کہ معاملہ ان کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ یہی حال باقی مسلمانوں کا تھا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے فرزانہ، ہمدرد وغم گسار شخص کو بھی نہ بخشا گیا۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق انھوں نے بھی راہ خدا میں زخم کھایا۔

مسلمانوں کے لیے ان حالات کا مقابلہ طاقت سے کرنا ممکن نہ تھا۔ کوئی چیز اگر ان کا حوصلہ قائم رکھ سکتی تھی تو وہ اللہ پر توکل، دین پر ثابت قدمی کے اچھے انجام اور آخرت کی کامرانی کا یقین تھا۔ اس موقع کی مناسبت سے متعدد آیات قرآنی نازل ہوئیں۔ چونکہ آدمی دوسرے کی مثال سے سبق حاصل کرتا ہے، اس لیے اہل ایمان کی تربیت کی خاطر بنی اسرائیل کے ان نوجوانوں کا حوالہ دیا گیا جو فرعون کے تشدد کے اندیشہ کے باوجود حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے والے بنے۔ انھوں نے جب اپنے رسول سے فرعونوں کے ظلم کا تذکرہ کیا تو انھوں نے ان کو اللہ پر بھروسا کرنے اور اسی سے مدد مانگنے کی ہدایت کی۔ قرآن میں بتایا گیا:

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ . وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ. وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ. فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ	''موسیٰ کی بات نہ مانی، مگر اس کی قوم کے تھوڑے سے نوجوانوں نے، فرعون اور اپنے بڑوں سے ڈرتے ہوئے کہ مبادا وہ ان کو کسی فتنہ میں ڈال دے۔ بے شک فرعون ملک میں نہایت سرکش اور حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا۔ اور موسیٰ نے کہا: اے میری قوم کے لوگو، اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر

تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ. وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ. وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ. (یونس۱۰: ۸۳-۸۷)

بھروسا کرو، اگر تم اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر چکے ہو۔ وہ بولے کہ ہم نے اللہ پر بھروسا کیا۔ اے ہمارے رب، ہمیں ظالموں کے ظلم کی آماجگاہ نہ بنا اور ہمیں اپنے فضل سے کافروں کے پنجۂ ستم سے چھڑا۔ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھہرا لو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز کا اہتمام کرو۔ اور ایمان لانے والوں کو خوش خبری دے دو۔''

معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کے لیے بعض گھر مخصوص کر لینے کی اسی ہدایت کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ارقم بن عبد مناف رضی اللہ عنہ کے گھر کا انتخاب فرمایا، جہاں مسلمان جمع ہوتے، نماز باجماعت ادا کرتے، قرآن سیکھتے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت وموعظت سے حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت حاصل کرتے۔ اس طرح دار ارقم مکہ میں اہل ایمان کی تعلیم وتربیت کا پہلا مرکز بن گیا۔

دار ارقم کے انتخاب کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ بیت اللہ سے کوہ صفا کی طرف یعنی جانب جنوب میں تھا۔ اس گھر میں نماز پڑھتے ہوئے خانہ کعبہ (ابراہیمی قبلہ) اور بیت المقدس (اہل کتاب کا قبلہ)، دونوں کو بیک وقت قبلہ بنانا ممکن تھا۔ چونکہ قبلہ کے بارے میں ابھی تک کوئی واضح حکم نازل نہیں ہوا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کے معروف قبلہ کو اپنے اجتہاد سے اختیار کر لیا۔ آپ کو ابراہیمی قبلہ سے علیحدگی بھی ناگوار تھی، اس لیے آپ دونوں قبلوں کو جمع کرتے۔ آپ کا طریقہ مسجد حرام کے اندر بھی یہی تھا کہ آپ رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان کی دیوار کو سامنے رکھ کر نماز ادا کرتے تھے تاکہ دونوں قبلے جمع ہو جائیں۔

دوسرے موقع پر قرآن کا ارشاد یوں ہے:

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ. وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. وَاللّٰهُ عَلٰى

''ہلاک ہوئے ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے، جبکہ وہ اس پر بیٹھے ہوں گے اور جو کچھ وہ اہل ایمان سے کرتے رہے، اس کو دیکھیں گے اور انھوں نے ان پر محض اس وجہ سے غصہ نکالا کہ وہ ایمان لائے اس خدائے عزیز وحمید پر، جس کی بادشاہی آسمانوں اور

كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْد. اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ.

(البروج ۸۵: ۴-۱۰)

زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو ستایا، پھر توبہ نہ کی، ان کے لیے لازماً جہنم کی سزا اور جلنے کا عذاب ہے۔‘‘

جب نوجوانوں کو ان کے کافر باپوں یا رشتہ داروں نے سختیاں کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین چھوڑنے پر مجبور کیا تو اس صورت حال میں قرآن نے ان کو واضح ہدایات دیں کہ اللہ نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت ضرور کی ہے، لیکن والدین کو یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اولاد کو اللہ کے شریک ماننے پر مجبور کریں۔ اس معاملہ میں ان کی اطاعت کی ضرورت نہیں۔ یہ بزرگان خاندان یہ بھی کہتے کہ ہم لوگ تم نوجوانوں سے زیادہ خیر وشر اور نیک و بد کو سمجھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے تم ہمارے طریقہ پر چلتے رہو۔ فرمایا:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا. وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا. اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ.

(العنکبوت ۲۹: ۸-۹)

’’اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھیرا جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں تو ان کی بات نہ مان۔ میری ہی طرف تم سب کی واپسی ہے، تو جو کچھ تم کرتے رہے ہو، میں اس سے تمھیں آگاہ کروں گا۔ اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کو صالحین کے زمرہ میں داخل کریں گے۔‘‘

اسلام قبول کرنے والے قریش کے ہاتھوں ظلم ہی نہیں سہ رہے تھے، بلکہ قریش کے دوسرے گھٹیا ہتھکنڈوں کا مقابلہ بھی کر رہے تھے۔ ان میں جو لوگ تجارت پیشہ تھے، ان سے لین دین نہیں کرنے دیا جاتا تھا۔ جو لوگ محنت مزدوری کرتے تھے، ان کو ان کا حق خدمت دینے میں لیت ولعل سے کام لیا جاتا۔ مثال کے طور پر حضرت خباب رضی اللہ عنہ نیزے بھالے بنانے کا کام کرتے تھے۔ قرشی لیڈر عاص بن وائل کے ذمہ ان کی مصنوعات کی قیمت نکلتی تھی۔ عاص نے ان کی ادائیگی روک لی۔ خباب رضی اللہ عنہ اس کے پاس تقاضا کرنے گئے تو وہ کہنے لگا کہ جب تک محمد کا انکار نہیں کرو گے، اس وقت تک میں کچھ نہیں دوں گا۔ خباب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: جب تک اللہ تجھے موت نہ دے دے یہ کام تو میں کرنے کا نہیں، بلکہ اس وقت تک بھی نہیں کروں گا جب مرنے کے بعد تمھارے جی

اٹھنے کا وقت آئے گا۔ وہ بولا: ٹھیک ہے، مجھے میرے حال پر چھوڑو، یہاں تک کہ میں مر جاؤں، پھر اٹھایا جاؤں، پھر مجھے مال واولاد ملے۔ جب ایسا ہو گا تو میں تیرا قرض ادا کر دوں گا[1]۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے خلاف قرآن کا یہ موقف پیش کیا کہ یہ ایک من گھڑت نظام ہے جس کی کوئی گنجایش دین ابراہیمی میں ہے اور نہ اس کے حق میں کوئی عقلی دلیل ہے، یہ گمراہی پچھلے دور کے لوگوں نے بے دلیل اختیار کر لی تو قریش کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ ان کے خیال میں اگر یہ تصور عوام الناس میں پھیل جاتا تو ان کے اقتدار کی ساری عمارت زمین بوس ہو سکتی تھی۔ اس لیے انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں مزید خاموشی کو خلاف مصلحت سمجھا اور آپ کی راہ روکنے کے لیے موثر طریقے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

اشراف قریش کا ایک وفد بنو ہاشم کے سردار ابوطالب کے پاس گیا اور شکایت کی کہ آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے، ہمارے مذہب کو غلط قرار دیتا ہے، ہمارے آبا و اجداد کو گمراہ سمجھتا ہے اور اپنے اس خیال کا برملا اظہار کرنے لگا ہے۔ اب یا تو آپ اس کو ایسا کرنے سے باز رکھیں یا اس کے اور ہمارے درمیان میں سے نکل جائیں تا کہ ہم خود اس سے نمٹ لیں۔ ابوطالب نے نرمی سے ان کو ٹھنڈا کیا اور خوش اسلوبی سے معاملہ کو ٹال دیا۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسی طرح زور و شور سے جاری رہی تو اشراف قریش دوبارہ وفد کی صورت میں ابوطالب کے پاس پہنچے اور اب یہ دھمکی دی کہ اگر آپ نے بھتیجے کو نہ روکا تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کی اور اس کی رائے ایک ہی ہے اور یہ چیز ہمارے درمیان لڑائی کا باعث بن جائے گی۔ ابوطالب کو اس الٹی میٹم سے سخت فکر لاحق ہوئی۔ انھوں نے رسول اللہ کو بلا بھیجا اور کہا کہ بھتیجے: اپنے اوپر اور میرے اوپر رحم کرو۔ مجھ پر اتنا بوجھ مت ڈالو جس کو میں برداشت نہ کر سکوں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ لگایا کہ چچا شاید اب میرا ساتھ چھوڑ جائیں، کیونکہ ان کی باتوں سے کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: چچا جان، میں اس کام کو نہیں چھوڑوں گا، یہاں تک کہ اللہ مجھے غلبہ عطا فرمائے گا یا میں اس جد و جہد میں ختم ہو جاؤں گا۔ ابوطالب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جب یہ عزم دیکھا تو کہا: بھتیجے، جاؤ جو تبلیغ چاہو کرو۔ میں تمھیں ان لوگوں کے حوالے کبھی نہیں کروں گا۔

قریش نے ابوطالب کو یہ پیشکش بھی کی کہ آدمی کے بدلے آدمی لے کر تصفیہ کر لیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالہ کر دیں۔ مطعم بن عدی، جو عبد مناف ہی کے خاندان بنو نوفل سے تھا، اس تجویز پر قریش کا ہم نوا ہو گیا۔ ابوطالب کو یہ تجویز ہتک آمیز لگی کہ بنو ہاشم کا بہترین فرد قریش کے حوالے کر دیا جائے کہ وہ اس کو قتل کر سکیں، لہٰذا

---

[1] صحیح بخاری: کتاب البیوع باب ذکر القین والحداد۔

انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اس سے بنو عبد مناف بھی تقسیم ہو گئے۔ صرف بنو ہاشم (سوائے ابولہب کے) اور بنو مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ گئے۔

قریش کی پیدا کردہ دہشت اور خوف کی حالت میں بھی جب اسلام قبول کرنے والے نوجوان اور لونڈی غلام ثابت قدم رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کے نئے نئے پہلو اجاگر کرتے رہے تو قریش کے اکابر کی تشویش مزید بڑھ گئی۔ انھیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ اس دعوت کا مقابلہ کیسے کریں۔ ہر لیڈر اپنی سی کوشش کرتا، لیکن ناکام ہو جاتا۔ اس سلسلہ کی ایک کوشش ایک بڑے لیڈر عتبہ بن ربیعہ نے بھی کی۔ اس نے دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گفت وشنید کرتا اور کچھ پیش کش کرتا ہوں۔ ممکن ہے یہ منصوبہ کام کر جائے اور وہ کوئی بات قبول کر کے اپنی جدوجہد سے باز آ جائے۔ قریش نے اجازت دی تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا۔

عتبہ نے کہا: بھتیجے، ہمارے خاندان میں تمھیں جو شرف اور عزت کا مقام حاصل ہے، وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ لیکن تم نے اپنی قوم کو بڑی مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ ان کے معبودوں اور دین کو عیب لگا کر ان کی عقلوں کو ماؤف کر دیا ہے۔ تم ان کے آبا کو کافر کہتے ہو۔ اگر تم اس جدوجہد سے مال و دولت چاہتے ہو تو ہم تمھیں مال اکٹھا کر کے دے سکتے ہیں۔ اگر شرف چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا سردار تسلیم کر لیتے ہیں۔ تمھارے بغیر ہم کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ اگر بادشاہت چاہتے ہو تو تمھیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں۔ اگر تم پر کسی جن کا اثر ہے تو ہم کسی ماہر جھاڑ پھونک کرنے والے کو طلب کر لیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سنتے رہے۔ جب اس نے بات ختم کی تو آپ نے سورہ حٰم السجدہ کی تلاوت کی۔ اس کے بعد فرمایا: تمھارا معاملہ اس تعلیم سے ہے۔ عتبہ واپس اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور ان کو بتایا کہ میں نے محمد سے جو کلام سنا ہے، اس کی نظیر موجود نہیں۔ نہ یہ شعر ہے، نہ جادو، نہ کہانت۔ اے قریش، میری مانو تو اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ کلام کسی بڑے انجام تک پہنچنے والا ہے۔ اگر عرب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کسی مصیبت میں ڈالیں گے تو تمھارا مقصد اس میں حصہ لیے بغیر بھی پورا ہو جائے گا۔ اگر یہ شخص غلبہ پا گیا تو اس کی حکومت تمھاری حکومت اور اس کی عزت تمھاری عزت ہو گی۔ اس پر قریش نے کہا: اے ابوالولید، اس شخص نے اپنے کلام سے آپ پر جادو کر دیا ہے۔ عتبہ نے کہا: میں نے اپنی رائے دے دی، اب جو چاہو کرو۔

جب ہشام بن الولید کے بھائی الولید بن الولید مسلمان ہوئے تو بنو مخزوم کے کچھ لوگ ہشام کے پاس پہنچے۔ وہ

یہ تجویز لے کر گئے تھے کہ ان کے خاندان کے نوجوان مثلاً سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور الولید بن الولید مسلمان ہو چکے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ نئے دین میں شامل ہونے والوں کو سزا دیں۔ لہٰذا الولید کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ ہشام نے کہا کہ الولید کو لے جاؤ، لیکن اس کو بچا کر رکھنا۔ اللہ کی قسم، اگر تم نے اس کو قتل کیا تو میں تمھارے خاندان کے اشراف میں سے کسی بڑے آدمی کو بدلے میں قتل کر دوں گا۔ جب بنومخزوم کے لوگوں نے یہ جواب سنا تو کان لپیٹ کر واپس چلے گئے[۲]۔

اب تک قریش مسلمان ہونے والوں کو اذیتیں دیتے تھے، لیکن اب انھوں نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ آپ کسی کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین فرماتے تو لوگ آپ کو برا بھلا کہتے اور آپ پر خاک پھینکتے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں نماز ادا کر رہے تھے تو ایک شقی القلب لیڈر عقبہ بن ابی معیط نے آپ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اتنے زور سے کسا کہ آپ کا گلا گھٹنے لگا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا اور عقبہ کو دھکا دے کر علیحدہ کیا۔ ایک مرتبہ آپ طواف کر رہے تھے۔ اس وقت عقبہ بن ابی معیط، ابوجہل اور امیہ بن خلف حطیم میں مجلس آرا تھے۔ ہر شوط پر جب آپ ان کے پاس سے گزرتے تو وہ آوازے کستے۔ تین شوط کے بعد آپ نے رک کر ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ اس پر وہ لوگ دہشت زدہ ہو گئے اور مزید جملے کسنے سے باز رہے۔

سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا اسلام

ایک مرتبہ ابوجہل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صفا کے پاس الجھ گیا۔ آپ کو برا بھلا کہا اور گالیاں دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی سے سب کچھ برداشت کیا اور ابوجہل کو کوئی جواب نہ دیا۔ ابوجہل مسجد میں جا کر لیڈروں کی محفل میں بیٹھ گیا۔ عبداللہ بن جدعان کی آزاد کردہ ایک لونڈی نے یہ سارا ماجرا دیکھا۔ اتنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب کمان لیے ہوئے مسجد میں طواف کے لیے داخل ہوئے تو اس خاتون نے ابوجہل کی حرکت سے ان کو مطلع کیا۔ وہ اپنے عزیز بھتیجے کے ساتھ اس غیر شریفانہ سلوک سے مشتعل ہو گئے۔ مسجد میں جا کر کمان ابوجہل کے سر پر دے ماری اور کہا: میرے بھتیجے کو گالی دیتے ہو۔ میں بھی اس کے دین پر ہوں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، میں بھی وہی کہتا ہوں۔ اگر ہمت ہے تو مجھ سے دو دو ہاتھ کر لو۔ اس صورت حال کو دیکھ کر بنومخزوم نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ لیکن حمزہ رضی اللہ عنہ کے اندر اس واقعہ سے جو انسان جاگا وہ اسلام کا بہت بڑا شیدائی اور جاں نثار ثابت ہوا۔

۲؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۱/۳۲۱۔

ادھر قریش کے لیے حمزہ رضی اللہ عنہ کا اسلام ایک غیر معمولی صدمہ تھا، کیونکہ یہ نہایت جری اور شجاع آدمی تھے۔

ایک دن ابوجہل نے ڈینگ مارتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں کل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اس کی نماز کے دوران میں حملہ کروں گا۔ جب وہ مسجد میں جائے گا تو میں ایک نہایت بھاری پتھر اس کے سر پر دے ماروں گا۔ بنو عبد مناف اس کے بعد جو کچھ کریں، مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی۔ اگلے دن وہ بہت بڑا پتھر مسجد حرام میں لے گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حسب معمول نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ قرشی سرداروں کی نظریں اب ابوجہل پر تھیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ میں گئے تو وہ اٹھا اور بھاری پتھر لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا۔ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ فاصلہ پر تھا تو وہ دہشت زدہ ہو کر پلٹا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں طاقت نہ رہی اور پتھر اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ قرشی سرداروں نے بھاگ کر اسے سہارا دیا اور پوچھا: ابوالحکم، کیا ہوا؟ اس نے بتایا کہ جونہی میں محمد کے قریب ہوا ایک عظیم الجثہ اونٹ آڑے آ گیا۔ میں نے اس جیسی کوہان، اس جیسے دانت اور گردن کسی اونٹ کے نہیں دیکھے۔ وہ لپک کر مجھے کھانے کو آیا جس سے میری حالت متغیر ہو گئی۔

دوسری روایت میں اونٹ کے بجائے آگ کی ایک کھائی کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اونٹ ہو یا آگ کی کھائی، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شیطان سے محفوظ رکھنے کا الٰہی انتظام تھا۔

ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ میں حرم میں جا کر بلند آواز سے تلاوت کروں گا۔ لوگوں نے منع کیا، لیکن وہ باز نہ آئے اور حرم میں جا کر سورۂ رحمٰن پڑھنا شروع کی۔ کفار ان پر ٹوٹ پڑے اور مارنا شروع کیا۔ وہ زخمی ہو گئے، لیکن تلاوت ختم نہ کی۔ واپس ہوئے تو چہرہ زخمی تھا۔

منافقین

پیغمبر کی دعوت کا جب چرچا ہوتا ہے تو اس کے اولین مخاطبوں کے علاوہ عوام الناس میں بھی اس کی بات سننے کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔ جو لوگ پہلے سے حق کے متلاشی ہوتے ہیں، ان کے لیے پیغمبر کی دعوت اجنبی نہیں ہوتی۔ وہ اس کو اپنے دل کی آواز سمجھتے، اس کو لپک کر قبول کرتے اور پھر ہر قیمت پر اس دولت کی حفاظت کرتے ہیں، خواہ اس راہ میں انھیں قربانیاں ہی دینی پڑیں۔ عقلیت پسند لوگ پیغمبر کے دلائل پر غور کرتے، اس کے ماضی و حال کا مطالعہ کرتے اور اس کو قبول کرنے کے نتائج و عواقب پر سوچ بچار کر کے کوئی فیصلہ کرتے ہیں، اور جب فیصلہ کر لیتے ہیں تو

اس پر قائم رہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کسی خارجی اثر کے تحت پیغمبر کے قریب تو آ جاتے ہیں، لیکن وہ پیغمبر کی دعوت کے تقاضوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ آگے چل کر حالات کیا رخ اختیار کریں گے، معاشرہ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں، اور جو لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں ان کو آیندہ کن احوال سے گزرنا پڑے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت جب مکہ میں پھیلی تو کئی ایسے نوجوان بھی اس سے متاثر ہوئے جنھوں نے قبول اسلام کی ذمہ داریوں کے پیش وعقب کو نہیں سمجھا۔ وہ مسلمان ہوئے تو ابتدا میں انھیں کوئی مشکل پیش نہ آئی، لیکن جب آباواجداد اور اعزہ واقربا کی طرف سے سختی شروع ہوئی تو وہ گھبرا گئے۔ والدین ان کو سمجھاتے کہ اس نئے دین کو چھوڑو۔ ایسا کرنے سے تمھیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اگر یہ گناہ کا کام ہے تو اس کا وبال ہماری گردن پر ہوگا۔ جب وہ اس طرح کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آتے تو بڑے اپنی اولادوں کو اذیتیں دیتے اور زدوکوب کرتے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اگرچہ شادی شدہ اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے تھے، اس کے باوجود ان کا چچا ان کو رسی سے باندھ کر مارتا۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتا۔ جب نوجوانوں کو اس صورت حال سے گزرنا پڑتا تو خام ذہن کے لوگوں میں شبہات پیدا ہونے لگتے کہ جب ہم نے اللہ کا سیدھا راستہ اختیار کر لیا ہے تو اس پر چلنا اس قدر دشوار کیوں ہے؟ رسول اللہ پر ایمان لانا جان جوکھم کا کام کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سوالات راہ حق کے تقاضوں سے بے خبری کے باعث پیدا ہوتے تھے۔ لہٰذا قرآن نے بڑی وضاحت سے بتایا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اپنے نام لیواؤں کو آزمایشوں کی بھٹی میں سے گزارتا رہا ہے۔ جو لوگ انسانوں کی پہنچائی ہوئی اذیت سے اس طرح گھبراتے ہیں جس طرح خدا کے عذاب سے ڈرنا اور گھبرانا چاہیے تو وہ جان لیں کہ دنیا کا دکھ تو چندروزہ ہے، لیکن اگر امتحان سے گھبرا کر یہ اپنے دین اور اللہ واحد کی عبادت سے دستبردار ہو جائیں گے تو خدا کی پکڑ ابدی ہوگی۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں سے ان لوگوں کو ممیّز کرتا رہے گا جو منافق ہوں گے۔

وَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ. (العنکبوت ۲۹: ۱۱)	''اور اللہ ایمان لانے والوں کو بھی ممیّز کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی ممیّز کر کے رہے گا۔''

انھی کمزور ایمان والوں کے بارے میں دوسری جگہ فرمایا کہ جس حد تک حالات سازگار رہتے ہیں، وہ اہل ایمان کا ساتھ دیتے ہیں۔ جونہی کوئی آزمایش پیش آتی ہے، لڑکھڑا جاتے اور خدا سے مایوس اور بدگمان ہو کر دوسروں کو مولیٰ و مرجع بنا لیتے ہیں۔ تاہم مکہ کی پُرمحن زندگی میں نفاق کا فتنہ ابھر نہ سکا۔ قرآن مجید کا چونکہ یہ طریقہ ہے کہ وہ لوگوں کے

رویوں کے بعید نتائج کو بھی سامنے لاتا ہے تاکہ لوگ شروع ہی سے اخلاقی امراض سے اپنے آپ کو بچا سکیں، اس لیے یہاں بھی نمایاں کر دیا کہ یہ روش منافقین کی ہوتی ہے۔

قریش کی نئی منصوبہ بندی

بنو ہاشم کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت سے دستبردار کرنے میں جب قریش کو کوئی کامیابی نہ ہوئی، ابو طالب بحیثیت سربراہ خاندان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پناہی پر مصر رہے اور ان کے بھائیوں نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا، لیکن اپنے بھتیجے کو برابر تحفظ فراہم کرتے رہے، اسی طرح جو نوجوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے وہ ظلم و تشدد سہنے کے باوجود اپنے موقف پر قائم اور اختیار کردہ دین پر ثابت قدم رہے تو انھوں نے پیش آمدہ چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے دوسرے طریقوں پر غور شروع کیا۔ صورت حال یہ تھی کہ روز بروز مسلمان قوی تر ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ مکہ کے بہت سے گھروں میں یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ آبائی مذہب کو خیر باد کہہ کر کہیں کوئی باپ، کہیں بیٹا یا بھائی، کہیں شوہر اور کہیں بیوی، اسلام کی تعلیم قبول کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بن گئے اور ہر گھرانے میں ایک ایسی بحث چل نکلی جس سے پیچھا چھڑانا کسی کے لیے ممکن نہ رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور اسلام قبول کرنے والوں کی استقامت نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی، اس سے نکلنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ قریش اپنے منصب کے اصل تقاضوں، اپنے طرز عمل اور کمزوریوں کا جائزہ لے کر اصلاح پر آمادہ ہو جاتے، ان کی نگاہ مکہ کے ابراہیمی مرکز توحید کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں اپنی کوتاہیوں کی طرف اٹھتی اور وہ اپنے غیر فطری اور غیر اخلاقی نظام میں تبدیلی لاتے جو ان کے معاشرہ میں عوام الناس کے لیے مشکلات کا باعث بنا ہوا تھا۔ لیکن یہ طریقہ قریش کے متکبرانہ رویہ سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس سے ان کی انا مجروح ہوتی اور مفادات پر ضرب پڑتی تھی۔ اس لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ دوسرا طریقہ، جس سے وہ صورت حال کا مقابلہ کر سکتے تھے، یہ تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کی مخالفت کی راہیں تلاش کرتے۔ بدقسمتی سے انھوں نے اسی راستہ کا انتخاب کیا۔ حالات کا تجزیہ کرنے پر وہ اس نتیجہ تک پہنچے کہ لوگ دو اسباب کی بنا پر نئے دین کو اختیار کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام میں غیر معمولی تاثیر ہے۔ جو نوجوان اس کو سن لیتا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ جب کلام بار بار کسی کو سنایا جاتا ہے تو وہ اس کا اتنا شیدائی ہو

جاتا ہے کہ نہ کسی سختی کو خاطر میں لاتا اور نہ کسی ترغیب وتحریص کا اثر قبول کرتا ہے۔ چونکہ محمد اس کو وحی الٰہی قرار دیتے ہیں تو یہ چیز عوام کو مرعوب کر دیتی ہے۔ دوسرا یہ کہ لوگ محمد کے اس دعویٰ سے متاثر ہو گئے ہیں کہ وہ خدا کا نمائندہ ہے اور اس کی طرف سے اس کو جو پیغامات ملتے ہیں ان کے پہنچانے پر وہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔ ان دونوں باتوں کا توڑ ان کو اس میں نظر آیا کہ ایک طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ کلام کو ساقط الاعتبار ٹھہرائیں تا کہ لوگ اس کو اللہ کی جانب سے نازل شدہ کلام کی حیثیت نہ دیں، بلکہ ایک انسانی کاوش کے درجہ میں رکھیں۔ دوسری طرف ان کے اس دعویٰ کو جھٹلایا جائے کہ وہ خدا کے منتخب رسول ہیں تا کہ لوگ ان کو اپنے جیسا انسان ہی سمجھیں اور ان کے نبی ہونے کے دعویٰ سے مرعوب نہ ہوں۔ اگلے دو ابواب میں ہم قریش کے ان اعتراضات کا جائزہ لیں گے جو انھوں نے قرآن پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت پر کیے۔

(جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی'' سے انتخاب)

محمد وسیم اختر مفتی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین
کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

— ۸ —

سیرت و عہد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ قیصر و کسریٰ اور مصر وشام کے حکام جنگ کیے بغیر دعوت اسلام قبول کر لیں۔ خلیفۂ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی چاہتے تھے کہ عراق و ایران میں دور تک گھسنے (invasion) کی کارروائیاں نہ کی جائیں۔ فتح مدائن کے بعد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے پہاڑوں کے اس پار ایرانیوں کا پیچھا کرنے کی اجازت مانگی تو عمر رضی اللہ عنہ نے خط لکھا: میری خواہش ہے کہ صحراے عرب اور ایرانی سلسلہ ہاے کوہ کے بیچ کوئی بند ہو، وہ ہم تک پہنچ پائیں نہ ہم ان پر حملہ کریں۔ میرے خیال میں مسلمانوں کی سلامتی غنائم پر فوقیت رکھتی ہے۔ لیکن اس خطے میں پے در پے ہونے والے واقعات کی وجہ سے عمر رضی اللہ عنہ اپنی پالیسی پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ یہ ایرانی ہی تھے جن کی مسلسل عہد شکنیوں کی وجہ سے فتح ایران مکمل ہوئی، اگر وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کیے ہوئے معاہدات پر قائم رہتے تو امکان غالب تھا کہ ایران کے ایک بڑے حصے پر یزدگرد کی بادشاہت برقرار ہوتی۔

جنگ قادسیہ میں شکست کھانے کے بعد شاہ یزدگرد حلوان پھر رے کی طرف فرار ہوا جبکہ جنرل ہرمزان موت کے منہ سے بچنے کے بعد جنوب مشرقی عراق کے شہر اہواز (صوبۂ اہواز یا خوزستان کے صدر مقام) میں جا بسا۔ مسلمانوں

نے ایران کے اطراف میں بکھر جانے والے ان سورماؤں کا پیچھا نہ کیا اور اپنی توجہ عراق کی طرف مرکوز کر دی تو ایرانیوں کو خیال ہوا کہ مسلمان ان سے خوف زدہ ہو کر پیش قدمی کرنے سے رک گئے ہیں۔ اہل اہواز جوابی حملوں کی منصوبہ بندی کرنے میں پیش پیش تھے، وہ پہلے بھی صلح کا معاہدہ کر کے توڑ چکے تھے۔ ادھر بصرہ کے گورنر بدلتے رہے، عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ عتبہ بن غزوان کے ہاتھوں دوبارہ زیر ہوا تو وہ گورنر بنے۔ ان کی وفات کے بعد مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ لی۔ بصرہ میں موجود ایک صحابی ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے ان پر بنو ہلال کی ام جمیل سے زنا کا الزام لگایا تو عمر رضی اللہ عنہ نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ کا مقدمہ مدینہ میں خلیفہ کی عدالت میں پیش ہوا، لیکن چوتھے گواہ کے مضطرب ہونے کی وجہ سے تہمت ثابت نہ ہو سکی۔ انھی دنوں میں بحرین کے گورنر علاء بن حضرمی نے خلیفہ سے اجازت لیے بغیر بحری جہازوں کے ذریعے خلیج فارس کو عبور کیا اور رستے کے مقامات زیر کرتے ہوئے شہر اصطخر فتح کرنے کی ٹھانی۔ سمندری جنگ کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنی پشت کو محفوظ نہ کیا۔ ایرانیوں نے ان کی واپسی کا راستہ کاٹ دیا تو وہ محصور ہو گئے۔ تب عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ و کوفہ سے دستے بھیج کر انھیں چھڑایا اور ان کو گورنری سے ہٹا کر عراق میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ماتحت کر دیا۔ اہواز کے اہل سیاست نے ان تبدیلیوں سے تاثر لیا کہ اب مسلمان امرا اقتدار کی جنگ میں الجھ کر کمزور ہو جائیں گے۔ ان کا مشاہدہ تھا کہ اقتدار کی کشمکش میں شریک ایرانی اراکین سلطنت موقع پاتے ہی اپنے ساتھیوں کو کچل دیتے تھے، اس طرح انھیں اوپر آنے کا موقع مل جاتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اسلامی حکومت میں بھی ایسا کھیل کھیلا جائے گا، وہ کھلم کھلا عہد شکنی پر اتر آئے، انھوں نے سابق گورنر مغیرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ طے کیا ہوا جزیہ دینے سے انکار کر دیا۔

اہواز میں پناہ لینے کے بعد ہرمزان نے میسان اور دست میسان میں موجود مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ عتبہ بن غزوان نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے کمک حاصل کرنے کے بعد سُلمی بن قین رضی اللہ عنہ اور حرملہ بن مریطہ رضی اللہ عنہ کو ان دونوں شہروں کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ یہ دونوں بنو حنظلہ سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے بنو وائل و کلیب (بنو عم) کے لوگوں سے مدد لی جو ان کے چچیرے تھے اور ما قبل اسلام سے صوبۂ اہواز (خوزستان) میں آباد تھے۔ ایک رات جب ہرمزان نہر تیری اور دلث کے مابین تھا، بنو وائل و بنو کلیب نے ان دونوں شہروں پر قبضہ کیا اور سُلمی اور حرملہ نے اسے جا لیا۔ بہت جانی نقصان اٹھانے کے بعد ہرمزان اپنی فوج لے کر واپس اہواز شہر کو بھاگ گیا اور صلح کی درخواست کی۔ دریاے دجیل (دجلۂ کودک) اسلامی افواج اور ہرمزان

کے مقبوضہ اہواز کے بیچ میں فاصل بن گیا۔ غالب وائلی کو مناذر کا اور کلیب بن وائل کو نہر تیری کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ فتح کے بعد عتبہ اور سُلمی رضی اللہ عنہ ایک وفد لے کر عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور خمس ان کے حوالے کیا۔ احنف بن قیس نے بصرہ میں مقیم مسلمانوں کی پریشاں حالی کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا: ہم زمین شور میں جا پڑے ہیں، ایک طرف بیابان ہے اور دوسری طرف کھارا سمندر۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خسروی خاندان سے حاصل ہونے والے مال فے کا ایک حصہ اہل بصرہ کے لیے مختص کیا اور عتبہ کو حکم دیا کہ بصرہ کے معاملات احنف کے مشورے سے چلائے جائیں۔ ابن کثیر کے بیان کے مطابق بصرہ سے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی ایک لشکر اہواز بھیجا تھا۔ بلاذری کا کہنا ہے کہ نہر تیری ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اور مناذر ان کے مقرر کردہ کماندار ربیع بن زیاد نے فتح کیا۔

ادھر ہرمزان اور غالب وکلیب میں سرحد کے تعین میں اختلاف ہو گیا۔ سُلمی رضی اللہ عنہ اور حرملہ رضی اللہ عنہ نے معاملہ نبٹانے کی کوشش کی تو ہرمزان نے ان کی ثالثی نہ مانی۔ اس نے کردوں کو ملا کر اچھی خاصی قوت فراہم کر لی تھی، اس لیے معاہدہ توڑ کر مقابلے پر اتر آیا۔ سُلمی نے عتبہ سے اور عتبہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے مدد چاہی۔ انھوں نے حرقوص بن زہیر سعدی رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں کمک بھیجی۔ ہرمزان اور حرقوص رضی اللہ عنہ کی افواج کے بیچ میں سوق اہواز کا پل تھا۔ ہرمزان کی دعوت پر مسلمانوں نے پل عبور کیا۔ سوق اہواز کے باہر لڑائی ہوئی۔ ہرمزان کو شکست ہوئی اور وہ رام ہرمز کی طرف بھاگا۔ حرقوص رضی اللہ عنہ نے جزء بن معاویہ کو اس کا پیچھا کرنے کے لیے بھیجا، وہ شغر تک گئے، لیکن ہرمزان ان کے ہاتھ نہ آیا۔ انھوں نے قریبی شہر دورق کا رخ کر لیا، یہاں کے باشندے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے، پھر جزیہ دینے پر آمادہ ہوئے اور واپس آ بسے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے صلح کی اجازت دینے کے ساتھ شہر میں نہر کھودنے اور بے آباد زمین کو آباد کرنے کی ہدایت کی۔ دوسری طرف حرقوص رضی اللہ عنہ نے اہواز کے باشندگان پر جزیہ عائد کیا اور خمس خلیفۂ ثانی کی خدمت میں مدینہ بھیج دیا۔ انھوں نے اہواز کے پہاڑ پر اپنی قیام گاہ بنائی۔ عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ لوگوں کو ان کے پاس آنے جانے میں دشواری پیش آتی ہے تو انھوں نے فوراً نیچے اتر آنے کی ہدایت کی۔ جب مقابلے کا چارہ نہ رہا تو ہرمزان نے بھی صلح کا خط لکھا، عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی درخواست قبول کر لی۔

یزدگرد اس وقت مرو یا اصطخر میں مقیم تھا، اس نے دیکھا کہ ایرانی جنگ جو مختلف اور متفرق معرکوں میں اسلامی افواج کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کر رہے ہیں تو انھیں ہدایت کی کہ ایک متحدہ فوج تشکیل دے کر مسلمانوں کا راستہ روکیں۔ حرقوص رضی اللہ عنہ، جزء اور سُلمی کو اس کی تیاریوں کی اطلاع پہنچی تو امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مطلع

کیا۔انھوں نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ نعمان بن مقرّن کی قیادت میں ایک بڑا لشکر فوراً اہواز بھیج دیا جائے۔عمر رضی اللہ عنہ نے چند دلیروں کے نام بھی تجویز کیے۔ پھر ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بھی حکم بھیجا کہ سہل بن عدی رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں ایک فوج بھیجی جائے جس میں براء بن مالک رضی اللہ عنہ، مجزاہ بن ثور اور عرفجہ بن ہرثمہ شامل ہوں۔ ہرمزان نے سبقت کی اور اربک کے مقام پر نعمان بن مقرّن کے لشکر کو روک لیا، ایک سخت جنگ کے بعد اسے شکست ہوئی تو واپس رام ہرمز کو پلٹا، پھر شوستر (تستر) جا کر قلعہ بند ہو گیا۔نعمان نے رام ہرمز پر قبضہ کیا اور اہل ایذج سے مصالحت کر لی۔ سہل رضی اللہ عنہ بصرہ سے چلے تھے، ان کو ہرمزان کی قلعہ بندی کا پتا چلا تو وہ بھی شوستر (تستر) پہنچ گئے۔اب سلمی، حرملہ، حرقوص اور جزء کی سربراہی میں دستے شوستر (تستر) کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ یزدگرد کی دعوت پر اطراف ایران سے آنے والے فوجیوں کا ایک بڑا لشکر شہر میں جمع ہو چکا تھا۔مسلمان فوجیوں نے فصیل شہر پھلانگنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔کوفہ و بصرہ کے سالار ابوسبرہ نے امیر المومنین سے مدد مانگی تو انھوں نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ایک نیا لشکر لے کر خود شوستر (تستر) جانے کی ہدایت کی۔ انھوں نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں کوفہ سے کمک بھی بھیجی۔محاصرے کو کئی ماہ گزر چکے تھے، ہرمزان نے شہر سے باہر نکل کر دوبدو لڑائی کا فیصلہ کر لیا، اسے فتح کا یقین تھا۔اس کی دعوت مبارزت پر براء بن مالک (انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بھائی) نکلے، لیکن شہید ہو گئے پھر مجزاہ بن ثور نے شہادت پائی۔اس کے بعد لڑائی رک گئی اور کوئی ایرانی آگے نہ آیا۔ایک دن گزر گیا اور دوسری صبح طلوع ہوئی۔اسی اثنا میں ایک ایرانی چھپتا ہوا آیا اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے پناہ طلب کی۔انھوں نے یہ شرط رکھی کہ وہ شہر میں داخل ہونے کا کوئی راستہ بتائے۔اس نے بتایا کہ جس نہری راستے کے ذریعے دریاے دجیل سے شہر کو پانی سپلائی کیا جاتا ہے، وہاں سے شہر میں گھسا جا سکتا ہے۔ اشرس بن عوف اس شخص کے ساتھ گئے، انھوں نے غلاموں کا بھیس بنایا ہوا تھا۔ایرانی نے انھیں شہر کے راستے سمجھا دیے اور ہرمزان کا پتا بتایا۔اب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اشرس کے ساتھ ۴۰ کمانڈو بھیجے، ۲۰۰ مہم جوان کے پیچھے پیچھے تھے۔ظلمت شب میں انھوں نے پہرے داروں کو قتل کر کے فصیل پر قبضہ کر لیا۔دروازے کھل گئے اور شہ سوار داخل ہوئے۔ ہرمزان فرار ہو کر قلعے میں جا گھسا۔اپنے آپ کو حوالے کرنے کے لیے اس نے یہ شرط لگائی کہ عمر رضی اللہ عنہ خود اس کے بارے میں فیصلہ کریں۔شرط مانی گئی تو اس نے ہتھیار ڈالے۔اس کا خوزستان اور جنوبی ایران کی حکمرانی کا خواب چور چور ہو چکا تھا۔اسے باندھ دیا گیا، قائد جیش ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور احنف بن قیس کی معیت میں اس کو عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کیا۔اب شہریوں کی طرف سے

کوئی مزاحمت نہ تھی۔ سقوط کے بعد خمس مدینہ ارسال کیا گیا، گھڑسوار کو تین ہزار درہم ملے جبکہ پیادہ کے حصے میں ایک ہزار آئے۔

شوستر سے چند میل دور مغرب میں واقع سوس (شوش یا شوشان) کے شہر میں ہرمزان کا بھائی شہریار حاکم تھا۔ محاصرۂ شوستر (تستر) کے دوران میں اہل سوس کی ابوسبرہ کی فوج سے کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں، ان میں مسلمانوں کو جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ چنانچہ شوستر (تستر) سے فارغ ہونے کے بعد ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے سوس کا رخ کیا۔ ایک طویل محاصرے کے بعد جب شہر والوں کا غلہ ختم ہو گیا تو انھوں نے ہتھیار ڈالے۔ دہقان سوس (امیر شوش) نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے اپنے ۱۰۰ اہل خانہ کی جان بخشی کا وعدہ لیا تھا، شومئ قسمت کہ اپنا نام لینے کا اسے خیال نہ رہا۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کی گردن اڑانے کا حکم دے دیا۔ شہر فتح کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں پر اللہ کے نبی دانیال علیہ السلام کی قبر ہے۔ ان کا جسد کھلا نظر آتا ہے اور لوگ ان سے بارش کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا، انھوں نے جسۂ مبارک کو کفن پہنا کر قبر بند کرنے کا حکم دیا۔ یہ قبر آج بھی موجود ہے، انیسویں صدی میں اس پر مزار تعمیر کیا گیا۔ فتح سوس (شوش) کے بعد ایرانی شاہ سوار سیاہ اور اس کے ساتھیوں نے اسلام قبول کیا، سیاہ نے اپنے لیے عطیات کا مطالبہ کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ کی اجازت سے ۶ سرداروں کو ۲۵۰۰ اور ۱۰۰ افراد کو ۲۰۰۰ دینار دے دیے گئے۔ سوس کے بعد جندیٰ سابور کا محاصرہ ہوا، اسلامی فوج میں شامل ایک غلام نے از خود شہر والوں کو امان کا پروانہ لکھ بھیجا۔ خلیفۂ دوم رضی اللہ عنہ نے اس کی منظوری دے دی۔

انس رضی اللہ عنہ اور احنف مدینہ کے قریب پہنچے تو انھوں نے ہرمزان کو اس کا سونے سے جڑاؤ کیا ہوا دیبا کا لباس پہنایا، موتیوں اور جواہرات سے مزین تاج (آزین) سر پر رکھا اور خالص سونے سے بنا ہوا، موتیوں اور یاقوت سے مرصع عصا ہاتھ میں تھما دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں نہ تھے، انھیں بتایا گیا کہ وہ اہل کوفہ کے ایک وفد سے ملنے مسجد نبوی گئے ہیں۔ وہاں بھی نہ ملے تو مدینہ کے کچھ لڑکوں سے معلوم ہوا، کوفی وفد واپس ہوا تو انھوں نے چغہ اتار کر سر تلے دابا اور مسجد کے دائیں کنارے سو گئے۔ ہرمزان انھیں اس حالت میں سویا دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے پوچھا: ان کا ایوان کیا ہوا اور دربان کہاں ہیں؟ عمر رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے تو ہرمزان کو فوراً اس کی ہیئت سے پہچان لیا۔ انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس جیسے لوگ اسلام کے مطیع ہو گئے ہیں، انھوں نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ اس جاہ سے دھوکا نہ کھائیں۔ امیر المومنین نے ہرمزان سے اس وقت تک گفتگو کرنے سے انکار کر دیا جب تک وہ اپنی شاہانہ وضع نہیں بدلتا۔ انھوں نے بار بار اس سے اس کی عہد شکنی کا سبب پوچھا۔ اس نے عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں

میں غصہ دیکھا تو کہا: مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے قتل کرا دیں گے۔ اس نے پانی منگوایا، مٹی کے پیالے میں پانی دیا گیا تو پینے سے انکار کر دیا۔ دوسرا پیالہ آیا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے پیالہ تھام کر کہا: مجھے پانی پیتے ہوئے مروا دیا جائے گا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو تسلی دی کہ تمھارے پانی پینے تک تمھیں کچھ نہ کہا جائے گا۔ ہرمزان نے پیالہ انڈیلا اور پانی گرا دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے پانی دوبارہ لانے کا حکم دیا تو اس نے کہا: اب میں پانی نہ پیوں گا، مجھے تو امان چاہیے تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے کہا: میں تمھیں مار ڈالوں گا۔ ہرمزان نے کہا: آپ مجھے امان دے چکے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم جھوٹ بولتے ہو۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ، احنف بن قیس اور دوسرے حاضرین نے اس کے امان میں آنے کی تائید کی تو وہ خاموش ہو گئے اور کہا: ہرمزان، تو نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ بخدا، میں صرف مسلمان ہی سے دھوکا کھاتا ہوں۔ تب ہرمزان مسلمان ہو گیا اور مدینے میں مقیم ہو گیا۔ امیر المومنین نے اس کے لیے ۲ ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا۔ وہ عمر کے ساتھ ساتھ رہتا اور وہ بھی اس سے مشورہ طلب کرتے۔ جب خلیفۂ ثانی کی شہادت ہوئی تو ہرمزان ہی پران کے قتل کی سازش رچانے کا الزام لگا۔ عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اسی بنا پر اسے اور اس کے ساتھی جفینہ کو قتل کیا۔

سیدنا عمر کو بہت تجسس تھا کہ ایرانی مسلمانوں سے کیے ہوئے معاہدات کا پاس کیوں نہیں کرتے؟ بار بار ان کی طرف سے عہد شکنی کیوں ہوتی ہے؟ ان کا خیال تھا کہ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ مسلمان اہل کارذمیوں سے اچھا سلوک نہ کرتے ہوں۔ شوستر (تستر) سے آنے والے وفد نے اس خیال کی شدت سے نفی کی۔ احنف بن قیس نے کہا: آپ نے ہمیں ملک ایران میں مزید پیش قدمی سے روک رکھا ہے جبکہ ایرانی بادشاہ یزدگرد اپنی قوم میں موجود ہے اور انھیں ہمارے خلاف اکساتا رہتا ہے۔ آپ اجازت دیں، ہم آگے بڑھ کر اس کا رہا سہا اقتدار بھی ختم کر ڈالیں۔ ایرانیوں کو کسی جانب سے امید نہ رہے گی تب ہی ان کا جوش مزاحمت سرد پڑے گا۔ ہرمزان نے بھی اس بات کی تائید کی تو عمر رضی اللہ عنہ کو اطمینان ہو گیا۔

ادھر نہاوند میں اکٹھے ہونے والے ایرانی سردار جو اپنی پے در پے شکستوں کے اسباب پر غور کر رہے تھے، اس نتیجے پر پہنچے کہ ایران کی مرکزی حاکمیت کمزور ہونے سے اس کی افواج بھی کمزور پڑ گئی ہیں۔ سب نے مل کر یزدگرد کو دعوت دی کہ وہ ایران کی شاہی روایات کا امین ہونے کی وجہ سے اپنی افواج کی قیادت خود کرے۔ اس نے یہ دعوت بخوشی قبول کر لی۔ شاہ مدائن سے فرار ہونے کے بعد در بدر کی ٹھوکریں کھا چکا تھا، وہ حلوان سے رے آیا، وہاں سے اصفہان پہنچا، پھر اصطخر۔ اس کے بعد مرو اس کی پناہ گاہ رہی۔ اس نے ایران کے گوشے گوشے میں موجود فوجی قوت

نہاوند منتقل کرنے کی ہدایت کی۔ اس طرح ۱۵ لاکھ کی فوج نہاوند میں اکٹھی ہوگئی، فیرزان ان کی قیادت کر رہا تھا۔ اب خلیفۂ ثانی کے لیے ممکن نہ تھا کہ پیش قدمی سے گریز کرنے کی پالیسی برقرار رکھتے، انھوں نے فتوحات عجم کو وسعت دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اسی اثنا میں کوفہ کے لوگ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے خلاف طرح طرح کی شکایتیں دارالخلافہ ارسال کر رہے تھے۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ وہ تو نماز بھی خوب نہیں پڑھاتے۔ اس مہم میں جراح بن سنان پیش پیش تھا۔ مدینہ میں ان کا وفد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملا تو انھوں نے محمد مسلمہ کو تحقیقات کے لیے کوفہ بھیجا۔ محمد، سعد اور جراح مدینہ پہنچے، سعد رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا تھا پھر بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں معزول کرنا بہتر سمجھا۔ انھوں نے کوفہ میں سعد رضی اللہ عنہ کے قائم مقام امیر عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہ کی تقرری برقرار رکھی۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اطلاع بھیجی کہ فیرزان اپنی فوج لے کر ہمدان جا رہا ہے، اس کی منزل حلوان ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھانے کے بعد لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا میں خود قیادت کرتے ہوئے اسلامی فوج عراق لے جاؤں؟ کچھ لوگوں نے اثبات میں جواب دیا، تاہم علی رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ نے اسلامی سلطنت کو ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ عجمی آپ کو میدان جنگ میں پا کر ختم کرنے کی کوشش کریں گے، اگر یہ لڑی بکھر گئی تو دوبارہ کبھی اکٹھی نہ ہو سکے گی۔ آپ اہل کوفہ کو خط لکھیں کہ وہ اس مہم میں شریک ہوں اور اہل بصرہ ان کے ساتھ تعاون کریں۔ مزید مشاورت کے بعد نعمان بن مقرّن رضی اللہ عنہ کو کمانڈر مقرر کرنے کا فیصلہ ہوا۔

[باقی]

جاوید احمد غامدی

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ میں نے اِس دین کو جس طرح سمجھا ہے، اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دیا ہے۔ یہ اِسی کتاب کا خلاصہ ہے جس میں کتاب کا نفس مضمون اُس کے علمی مباحث اور اُن کے استدلالات سے الگ کر کے سادہ طریقے پر پیش کر دیا گیا ہے۔

—— جاوید

اخلاقیات

ایمان کے بعد دین کا اہم ترین مطالبہ تزکیۂ اخلاق ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ انسان خلق اور خالق، دونوں سے متعلق اپنے عمل کو پاکیزہ بنائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے عمل صالح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تمام شریعت اِسی کی فرع ہے۔ تمدن کی تبدیلی کے ساتھ شریعت تو بے شک، تبدیل بھی ہوئی ہے، لیکن ایمان اور عمل صالح اصل دین ہیں، اِن میں کوئی ترمیم و تغیر کبھی نہیں ہوا۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ جو شخص اللہ کے حضور میں آئے اور اُس کے پاس یہ دونوں ہوں، اُس کے لیے جنت ہے اور وہ اُس میں ہمیشہ رہے گا۔

اِس کے ساتھ یہ بات بھی قرآن نے واضح کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان دیے ہیں، بالکل اِسی طرح نیکی اور بدی کو الگ الگ پہچاننے کے لیے ایک حاسۂ اخلاقی بھی عطا فرمایا ہے۔ وہ محض ایک حیوانی اور عقلی وجود ہی نہیں ہے، اِس کے ساتھ ایک اخلاقی وجود بھی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اُس کے دل و دماغ میں الہام کر دیا گیا ہے۔ یہ امتیاز ایک عالم گیر حقیقت ہے۔ چنانچہ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو پہلے مرحلے میں اُسے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی معاملہ نیکی کا ہے۔ انسان اُس سے محبت کرتا ہے، اُس کے لیے اپنے اندر عزت

اور احترام کے جذبات پاتا ہے اور اپنے لیے جب بھی کوئی معاشرت پیدا کرتا ہے، اُس میں حق و انصاف کے لیے لازماً کوئی نظام قائم کرتا ہے۔ یہ اِس امتیاز خیر و شر کے فطری ہونے کا ثبوت ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ برائی کے حق میں انسان بعض اوقات بہانے بھی تراش لیتا ہے، لیکن جس وقت تراشتا ہے، اُسی وقت جانتا ہے کہ یہ بہانے وہ اپنی فطرت کے خلاف تراش رہا ہے۔ اِس لیے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اُس کے ساتھ کر بیٹھے تو بغیر کسی تردد کے وہ اُسے برائی ٹھیراتا اور اُس کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔

اِس الہام کی تعبیر میں، البتہ اشخاص، زمانے اور حالات کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اِس کی گنجایش بھی اُس نے باقی نہیں رہنے دی اور جہاں کسی بڑے اختلاف کا اندیشہ تھا، اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے خیر و شر کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اِن پیغمبروں کی ہدایت اب قیامت تک کے لیے قرآن مجید میں محفوظ ہے۔ انسان اپنے اندر جو کچھ پاتا ہے، یہ ہدایت اُس کی تصدیق کرتی ہے اور انسان کا وجدانی علم، بلکہ تجربی علم، قوانین حیات اور حالات وجود سے استنباط کیا ہوا علم اور عقلی علم، سب اِس کی گواہی دیتے ہیں۔ چنانچہ اخلاق کے فضائل و رذائل اِس کے نتیجے میں پوری قطعیت کے ساتھ متعین ہو جاتے ہیں۔

بنیادی اصول

اِس باب میں بنیادی اصول کی حیثیت جس چیز کو حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو عدل و احسان کا اور قرابت مندوں کو دیتے رہنے کا حکم دیتا ہے اور فواحش، منکرات اور سرکشی سے روکتا ہے۔ یہ سب چیزیں، بالکل فطری ہیں، لہٰذا خدا کے دین میں بھی ہمیشہ مسلّم رہی ہیں۔ تورات کے احکام عشرہ اِنھی پر مبنی ہیں اور قرآن نے بھی اپنے تمام اخلاقی احکام میں اِنھی کی تفصیل کی ہے۔

ہم یہاں اِن کی وضاحت کریں گے۔

پہلی چیز عدل ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا جو حق واجب کسی پر عائد ہوتا ہے، اُسے بے کم و کاست اور بے لاگ طریقے سے ادا کر دیا جائے، خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقت ور اور خواہ ہم اُسے پسند کریں یا ناپسند۔

دوسری چیز احسان ہے۔ یہ عدل سے زائد ایک چیز اور تمام اخلاقیات کا جمال و کمال ہے۔ اِس سے مراد صرف یہ نہیں کہ حق ادا کر دیا جائے، بلکہ مزید براں یہ بھی ہے کہ ہم دوسروں سے باہمی مراعات اور فیاضی کا رویہ اختیار کریں۔ اُن کے حق سے اُنھیں کچھ زیادہ دیں اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس سے

معاشرے میں محبت ومودت، ایثار واخلاص، شکرگزاری، عالی ظرفی اور خیر خواہی کی قدریں نشو ونما پاتی اور زندگی میں لطف وحلاوت پیدا کرتی ہیں۔

تیسری چیز قرابت مندوں کے لیے انفاق ہے۔ یہ احسان ہی کی ایک اہم فرع ہے اور اُس کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرابت مند صرف اِسی کے حق دار نہیں ہیں کہ اُن کے ساتھ عدل واحسان کا رویہ اختیار کیا جائے، بلکہ اِس کے بھی حق دار ہیں کہ لوگ اپنے مال پر اُن کا حق تسلیم کریں، اُنھیں کسی حال میں بھوکا ننگا نہ چھوڑیں اور اپنے بال بچوں کے ساتھ اُن کی ضرورتیں بھی جس حد تک ممکن ہو، فیاضی کے ساتھ پوری کرنے کی کوشش کریں۔

اِن کے مقابلے میں بھی تین ہی چیزیں ہیں جن سے روکا گیا ہے۔

پہلی چیز فواحش ہیں۔ ان سے مراد زنا، اغلام اور اِن کے متعلقات ہیں۔

دوسری چیز منکرات ہیں۔ یعنی وہ کام جنھیں انسان بالعموم بُرا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور جن کی برائی ایسی کھلی ہوئی ہے کہ اُس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مذہب وملت اور تہذیب وتمدن کی ہر اچھی روایت میں اُنھیں برا ہی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن نے اِن کے لیے ایک جگہ 'منکر' اور دوسری جگہ 'اثم' کا لفظ استعمال کر کے واضح کر دیا ہے کہ اِن سے مراد وہ کام ہیں جن سے دوسروں کے حقوق تلف ہوتے ہوں۔

تیسری چیز سرکشی ہے۔ یعنی آدمی اپنی قوت، طاقت اور زور واثر سے ناجائز فائدہ اٹھائے، حدود سے تجاوز کرے اور دوسروں کے حقوق پر، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے، دست درازی کرنے کی کوشش کرے۔

فضائل ورذائل

اِس اجمال کی شرح قرآن نے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمائی ہے۔ چنانچہ اُس کی آیات ۲۲-۳۹ میں اخلاق کے فضائل ورذائل اُس نے بالکل متعین طریقے پر واضح کر دیے ہیں۔ اِن میں، اگر غور کیجیے تو سلسلۂ بیان کی ابتدا بھی شرک کی ممانعت سے ہوتی ہے اور اُس کا خاتمہ بھی اِسی کی تاکید پر کیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب کسی چیز کی اہمیت کو نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں اِس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ درمیان میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، اُن کے لیے یہ عقیدہ گویا شہر پناہ ہے جس کے وجود سے شہر قائم رہتا اور جس میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے تو پورا شہر خطرے کی زد میں آ جاتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت اِن آیتوں میں بیان ہوئی ہے، اُس کے لیے

توحید کی حیثیت یہی ہے۔ یہ اُس عدل کا سب سے بڑا اور بنیادی تقاضا ہے جس کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ چنانچہ شرک کو اِسی بنا پر ظلم عظیم کہا گیا ہے اور اِس کا یہ نتیجہ بھی قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک نا قابل معافی جرم ہے جس کی پاداش میں لوگ راندہ اور ملامت زدہ ہو کر جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔

یہ شرک کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو الٰہ بنایا جائے تو قرآن اپنی اصطلاح میں اُسے شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو خدا کی ذات سے یا خدا کو اُس کی ذات سے سمجھا جائے یا خلق میں یا مخلوقات کی تدبیر امور میں کسی کا کوئی حصہ مانا جائے اور اِس طرح کسی نہ کسی درجے میں اُسے اللہ تعالیٰ کا ہم سر بنا دیا جائے۔

پہلی صورت کی مثال سیدنا مسیح، سیدہ مریم اور فرشتوں کے بارے میں عیسائیوں اور مشرکین عرب کے عقائد ہیں۔ صوفیوں کا عقیدۂ وحدت الوجود بھی اِسی کے قبیل سے ہے۔

دوسری صورت کی مثال ہندوؤں میں برہما، وشنو، شیو اور مسلمانوں میں غوث، قطب، ابدال، داتا اور غریب نواز جیسی شخصیتوں کا عقیدہ ہے۔ ارواح خبیثہ، نجوم و کواکب اور شیاطین کے تصرفات کو بھی اِسی کے ذیل میں سمجھنا چاہیے۔

اِس کے علاوہ جو احکام اِن آیتوں میں بیان ہوئے ہیں، اُن کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

اللہ کی عبادت

پہلا حکم یہ ہے کہ جب اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو پھر عبادت بھی اُسی کی ہونی چاہیے۔ اِس عبادت کے بارے میں ہم اِس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اِس کی حقیقت خضوع اور تذلل ہے جس کا اولین ظہور پرستش کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر انسان کے عملی وجود کی رعایت سے یہی پرستش اطاعت کو شامل ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت کے مظاہر تسبیح و تحمید، دعا و مناجات، رکوع و سجود، نذر، نیاز، قربانی اور اعتکاف ہیں۔ دوسری صورت میں آدمی کسی کے لیے خدائی اختیارات مانتا اور مستقل بالذات شارع و حاکم کی حیثیت سے اُس کے حکم پر سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اللہ، پروردگار عالم کا فیصلہ ہے کہ اِن میں سے کوئی چیز بھی اُس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کوئی شخص اگر کسی کی تسبیح و تحمید کرتا ہے یا اُس سے دعا و مناجات کرتا ہے یا اُس کے لیے رکوع و سجود کرتا ہے یا اُس کے حضور میں نذر، نیاز یا قربانی پیش کرتا ہے یا اُس کے لیے اعتکاف کرتا ہے یا خدائی اختیارات مان کر اُس کی اطاعت کرتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے

اللہ تعالیٰ کے اِس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

والدین سے حسن سلوک

دوسرا حکم یہ ہے کہ والدین سے حسن سلوک کیا جائے۔ اِس کی تعلیم تمام الہامی صحائف میں دی گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ چنانچہ اللہ کی عبادت کے بعد سب سے پہلے اِسی کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے والدین ہی اُس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصیحت ماں اور باپ، دونوں کے بارے میں یہ ہے کہ اپنے پروردگار کے بعد انسان کو سب سے بڑھ کر اُنھی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ شکر محض زبان سے ادا نہیں ہوتا۔ اِس کے چند لازمی تقاضے ہیں جو قرآن نے سورۂ بنی اسرائیل کی اِن آیتوں میں بیان کر دیے ہیں۔

پہلی بات یہ فرمائی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ آدمی کو اِس طرح پیش آنا چاہیے کہ وہ ظاہر و باطن میں اُن کی عزت کرے، اُن کے خلاف اپنے دل میں کوئی بے زاری نہ پیدا ہونے دے، اُن کے سامنے سوء ادب کا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالے، بلکہ نرمی، محبت، شرافت اور سعادت مندی کا اسلوب اختیار کرے۔ اُن کی بات مانے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں میں اُن کی دل داری اور تسلی کرتا رہے۔

دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ والدین کے سامنے اطاعت وفرماں برداری کے بازو ہر حال میں جھکے رہیں اور یہ اطاعت وفرماں برداری تمام تر مہر و محبت اور رحمت وشفقت کے جذبے سے ہونی چاہیے۔ والدین جس طرح بچے کو پرندوں کی طرح اپنے بازوؤں میں چھپا کر رکھتے ہیں، بچوں کو بھی چاہیے کہ اُن کے بڑھاپے میں اِسی طرح اُن کو اپنی محبت واطاعت کے بازوؤں میں چھپا کر رکھیں۔ اِس لیے کہ والدین کی شفقت کا حق اگر کچھ ادا ہو سکتا ہے تو اِسی جذبے سے ہو سکتا ہے۔ اِس کے بغیر یہ حق ادا کرنا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ اِس کے ساتھ اُن کے لیے برابر دعا کی جائے کہ پروردگار جس طرح اُنھوں نے شفقت ومحبت کے ساتھ بچپن میں ہمیں پالا ہے، اُسی طرح اب بڑھاپے میں آپ اُن پر اپنی رحمت نازل فرمائیں۔ یہ دعا والدین کا حق ہے اور اُس حق کی یاددہانی بھی جو والدین سے متعلق اولاد پر عائد ہوتا ہے۔ پھر یہ اُس جذبۂ محبت کی محرک بھی ہے جس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ نے والدین سے حسن سلوک کے معاملے میں کیا ہے۔

والدین کے علاوہ جو تعلقات اِس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، اُن میں بھی آدمی کا رویہ درجہ بدرجہ یہی ہونا چاہیے۔

چنانچہ اعزہ واقربا، یتامیٰ ومساکین، پڑوسیوں، مسافروں اور زیردستوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اِسی بات کی نصیحت فرمائی ہے۔

اللہ کی راہ میں انفاق

تیسرا حکم یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں انفاق کیا جائے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں انسان کو بخشی ہیں، وہ جس طرح اُنھیں اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے، اُسی طرح اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد اُنھیں دوسرے ابنائے نوع پر بھی خرچ کرے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ کا بندہ بن کر رہنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے: ایک یہ کہ خالق کے ساتھ انسان کا تعلق ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے۔ دوسری یہ کہ مخلوق کے ساتھ وہ صحیح طریقے پر جڑ جائے۔ پہلی چیز نماز سے حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اولین مظہر ہے اور دوسری انفاق سے جو اُس کی مخلوق کے ساتھ محبت کا اولین مظہر ہے۔ پھر اِس کا صلہ بھی خدا کی محبت ہی ہے۔ اِس لیے کہ انسان جو کچھ خرچ کرتا ہے، اُسے درحقیقت آسمان پر جمع کرتا ہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں، اُس کا دل بھی اِس کے نتیجے میں وہیں لگا رہتا ہے۔

یہ انفاق اعزہ واقربا اور یتامیٰ ومساکین کا حق ہے جسے ادا کرنا ضروری ہے۔ اِس میں کوتاہی آدمی کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک غصب حقوق کا مجرم بنا سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے یہ بات ایک جگہ صاف واضح کر دی ہے کہ اِن حقوق سے بے پروا ہو کر اگر کوئی شخص مال و دولت جمع کرتا ہے تو یہ کنز ہے اور اِس کی سزا جہنم کی آگ ہے جس سے ہر بندۂ مومن کو اپنے پروردگار کی پناہ مانگنی چاہیے۔

اِس انفاق کی توفیق اُنھی لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے اخراجات میں اعتدال کا رویہ اختیار کرتے اور اللہ تعالیٰ جو رزق اُنھیں عطا فرماتے ہیں، اُس کو اپنی کسی تدبیر و حکمت کا نہیں، بلکہ اللہ کی عنایت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ دو باتیں مزید فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ مال کو اللے تللے اڑانا جائز نہیں ہے۔ یہ اللہ کی نعمت ہے اور اِس کے بارے میں صحیح رویہ یہ ہے کہ آدمی اعتدال اور کفایت شعاری کے ساتھ اپنی جائز ضرورتوں پر خرچ کرے اور جو کچھ بچائے، اُسے حق داروں کی امانت سمجھے اور اِس امانت کو نہایت احتیاط کے ساتھ ادا کرے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی ضرورتوں کے معاملے میں اعتدال اور توازن کا رویہ اختیار نہیں کرتا، اُسے اپنے ہی شوق پورے کرنے سے فرصت نہیں ملتی کہ دوسروں کے حقوق

ادا کر پائے۔ فرمایا کہ جو لوگ اپنا مال اِس طرح اڑاتے ہیں، وہ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ وہ اُنھیں ورغلا کر اپنی راہ پر لگا لیتا ہے اور اُن سے اُن کاموں پر خرچ کراتا ہے جن سے وہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے اُس کی ناراضی لے کر لوٹتے ہیں۔ اِس معاملے میں صحیح نقطۂ اعتدال کی وضاحت اِس طرح کی ہے کہ آدمی نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ لے اور نہ بالکل کھلے ہی چھوڑ دے کہ ضرورت کے وقت درماندہ اور ملامت زدہ ہو کر بیٹھا رہے، بلکہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرے اور ہمیشہ کچھ بچا کر رکھے تاکہ اپنے اور دوسروں کے حقوق بروقت ادا کر سکے۔

دوسری یہ کہ رزق کی تنگی اور کشادگی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے تحت ہے۔ انسان کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ پوری محنت کے ساتھ اِس کے اسباب پیدا کرے۔ جو لوگ اِس حقیقت کو نہیں سمجھتے، وہ دوسروں پر خرچ کرنا تو الگ رہا، بارہا ایسے سنگ دل ہو جاتے ہیں کہ تنگ دستی کے اندیشے سے اپنی اولاد تک کو قتل کر دیتے ہیں۔ اِس میں خاص طور پر عرب جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی اُس سنگ دلانہ رسم کی طرف اشارہ ہے جس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ عورت چونکہ کوئی کماؤ فرد نہیں ہے، اِس لیے اُس کی پرورش کا بوجھ کیوں اٹھایا جائے۔ فرمایا ہے کہ اُنھیں قتل نہ کرو، اُن کو بھی ہم ہی رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی اور مطمئن رہو کہ اللہ اپنے بندوں کی ہر حالت پر نگران اور اُن کا نگہبان ہے۔ وہ اُن سے بے خبر نہیں ہے۔

عفت و عصمت

چوتھا حکم یہ ہے کہ کوئی شخص زنا کے قریب نہ جائے۔ اِس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ کھلی بے حیائی اور نہایت بُرا طریقہ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اِس کے برائی اور بے حیائی ہونے پر کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کی فطرت اِسے ہمیشہ سے ایک بڑا گناہ اور ایک سنگین جرم سمجھتی رہی ہے اور جب تک وہ بالکل مسخ نہ ہو جائے، اِسی طرح سمجھتی رہے گی۔ انسان سے متعلق یہ حقیقت بالکل ناقابل تردید ہے کہ خاندان کا ادارہ اُس کے لیے ہوا اور پانی کی طرح ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ ادارہ صحیح فطری جذبات کے ساتھ صرف اُسی صورت میں قائم ہوتا اور قائم رہ سکتا ہے، جب زوجین کا باہمی تعلق مستقل رفاقت کا ہو۔ یہ چیز اگر مفقود ہو جائے تو اِس سے فطری اور روحانی جذبات سے محروم جانوروں کا ایک گلہ تو وجود میں آ سکتا ہے، کوئی صالح معاشرہ اور صالح تمدن وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ اِس فعل کی یہی شناعت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے صرف اتنی بات نہیں کہی کہ زنا نہ کرو، بلکہ فرمایا ہے کہ زنا

کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی تمام باتوں سے دور رہو جو زنا کی محرک، اُس کی ترغیب دینے والی اور اُس کے قریب لے جانے والی ہوں۔ سورۂ نور میں مرد و زن کے اختلاط کے جو آداب بیان ہوئے ہیں، وہ انسان کو اِسی طرح کی چیزوں سے بچانے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ مرد و عورت، دونوں اپنے جسمانی اور نفسیاتی تقاضوں کے لحاظ سے اپنی نگاہوں کو زیادہ سے زیادہ بچا کر اور اپنے جسم میں اندیشے کی جگہوں کو زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھیں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جو ایک دوسرے کے صنفی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی ہو۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان جب کسی معاشرے میں زنا کو عام کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنی تاخت کی ابتدا بالعموم اِنھی چیزوں سے کرتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم و حوا پر بھی وہ اِسی راستے سے حملہ آور ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے زنا کا چرچا کرنے اور اِس کے لیے ترغیبات پیدا کرنے کی کوشش کو اِسی بنا پر ایک بڑا جرم قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اِسی مقصد سے عورتوں کے تیز خوشبو لگا کر باہر نکلنے، مردوں کے پاس تنہا بیٹھنے یا اُن کے ساتھ تنہا سفر کرنے سے منع فرمایا۔ لوگوں نے دیور کے بارے میں پوچھا تو ارشاد ہوا کہ اُس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا موت کو دعوت دینا ہے۔ لمبے سفر میں محرم رشتہ داروں کو ساتھ لے جانے کی ہدایت کا مقصد بھی یہی ہے۔ پہلی کے بعد دوسری نظر کو فوراً پھیر لینے کے لیے بھی اِسی لیے کہا ہے۔ غنا اور موسیقی کی بعض صورتوں کے بارے میں بھی اِسی لیے متنبہ فرمایا ہے کہ وہ اِس کی محرک ہو سکتی ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ آدم کے بیٹے زنا میں سے کچھ نہ کچھ حصہ لازماً پا لیتے ہیں۔ چنانچہ دیدہ بازی آنکھوں کی زنا ہے، لگاوٹ کی بات چیت زبان کی زنا ہے، اِس طرح کی باتوں سے لذت لینا کانوں کی زنا ہے، ہاتھ لگانا اور اِس کے لیے چلنا ہاتھ پاؤں کی زنا ہے۔ پھر دل و دماغ خواہش کرتے ہیں اور شرم گاہ کبھی اُس کی تصدیق کرتی ہے اور کبھی جھٹلا دیتی ہے۔

انسانی جان کی حرمت

پانچواں حکم یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو قتل نہ کرے۔ مذہب و اخلاق کی رو سے انسانی جان کو جو حرمت ہمیشہ سے حاصل رہی ہے، یہ اُسی کا بیان ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اِس کے بارے میں یہی تاکید اِس سے پہلے بنی اسرائیل کو کی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ بات اُن پر لکھ دی تھی کہ ایک انسان کا قتل درحقیقت پوری انسانیت کا قتل ہے۔ تالمود میں یہ فرمان کم و بیش اِنھی الفاظ میں آج بھی موجود ہے۔

اِس کے ساتھ یہ بات بھی قرآن نے واضح کر دی ہے کہ اِس جرم کے مرتکبین کا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ

نہیں ہے، مقتول کے اولیا کے ساتھ بھی ہے اور اُن کو اللہ نے پورا اختیار دے دیا ہے، لہٰذا دنیا کی کوئی عدالت اُن کی مرضی کے بغیر قاتل کو کوئی رعایت نہیں دے سکتی۔ اُس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اگر قصاص پر اصرار کریں تو اُن کی مدد کرے اور جو کچھ وہ چاہیں، اُسے پوری قوت کے ساتھ اور ٹھیک ٹھیک نافذ کر دے۔

اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ قیامت میں یہی اختیار مقتول کو بھی حاصل ہوگا اور اُس کی مرضی کے بغیر قاتل کو وہاں بھی کوئی رعایت نہ مل سکے گی۔

یتیم کے مال میں خیانت

چھٹا حکم یہ ہے کہ یتیم کے مال میں کوئی ناجائز تصرف نہ کیا جائے۔ اِس حکم کے الفاظ وہی ہیں جو اوپر زنا سے روکنے کے لیے آئے ہیں۔ یعنی یتیم کی بہبود اور بہتری کے ارادے کے سوا اُس کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ یتیم کے مال میں صرف وہی تصرف جائز ہے جو اُس کی حفاظت اور نشوونما کی غرض سے کیا جائے اور اُسی وقت تک کیا جائے، جب تک یتیم سن رشد کو پہنچ کر اپنے مال کی ذمہ داری خود سنبھالنے کے قابل نہیں ہو جاتا۔

عہد کی پابندی

ساتواں حکم یہ ہے کہ جو عہد بھی کیا جائے، اُسے ہر حال میں پورا کیا جائے۔ فرمایا ہے کہ اِس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات پر بھی یہ حکم اِسی تاکید کے ساتھ آیا ہے۔ جہاد و قتال کے موقع پر بھی جو سب سے اہم ہدایت قرآن میں بیان ہوئی ہے، وہ یہی عہد کی پابندی ہے۔ سورۂ توبہ منکرین حق پر عذاب کی سورہ ہے اور اُس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو مشرکین عرب کے ساتھ تمام معاہدات ختم کر کے آخری اقدام کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اتنی بات اُس میں بھی واضح کر دی گئی ہے کہ کوئی معاہدہ اگر وقت کی قید کے ساتھ کیا گیا ہے تو اُس کی مدت لازماً پوری کی جائے گی۔ اِسی طرح انفال میں صاف بتا دیا گیا ہے کہ کوئی معاہد قوم اگر مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہی ہو تو معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اُن کی مدد نہیں کی جا سکتی۔

ناپ تول میں دیانت

آٹھواں حکم یہ ہے کہ ناپ تول میں کمی بیشی نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ زمین و آسمان کو اُس نے ایک

میزان پر قائم کیا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ انسان بھی اپنے دائرۂ اختیار میں انصاف پر قائم رہے اور ہمیشہ صحیح پیمانے سے ناپے اور ٹھیک ترازو سے تولے۔ اِس سے واضح ہے کہ یہ ایک عظیم حکم ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے اُسی میزان انصاف کی فرع ہے جس پر یہ دنیا قائم ہے۔ چنانچہ اِس سے انحراف اگر کوئی شخص کرتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ عدل وقسط کے تصور میں اختلال واقع ہو چکا اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کا عقیدہ باقی نہیں رہا۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ معیشت اور معاشرت کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور تمدن کی کوئی اینٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہتی۔

اشیا میں ملاوٹ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اگر کوئی شخص دودھ میں پانی، شکر میں ریت اور گندم میں جو ملا کر بیچتا ہے تو اِسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اِس لیے کہ پورا تول کر بھی وہ خریدار کو اُس کی خریدی ہوئی چیز پوری نہیں دیتا۔ یہ درحقیقت دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے جس کا نتیجہ دنیا اور آخرت، دونوں میں یقیناً بُرا ہوگا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، اِس لیے کہ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی یہی اچھا ہے۔

اوہام کی پیروی

نواں حکم یہ ہے کہ جس چیز کا علم نہ ہو، کوئی شخص اُس کے پیچھے نہ لگے۔ قرآن نے متنبہ فرمایا ہے کہ اِسے کوئی معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیے، اِس لیے کہ انسان کی سماعت و بصارت اور دل و دماغ، ہر چیز کو ایک دن خدا کے حضور میں جواب دہ ہونا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ کسی مسلمان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ بدگمانی کرے یا کسی پر الزام لگائے یا تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے یا محض شبہات پر افواہیں اڑائے یا اپنے پروردگار کی ذات و صفات اور احکام وہدایات کے بارے میں ظنون واوہام اور لاطائل قیاسات پر مبنی کوئی نقطۂ نظر اختیار کرے۔

غرور وتکبر

دسواں حکم یہ ہے کہ خدا کی زمین پر کوئی شخص اکڑ کر نہ چلے، اِس لیے کہ یہ مغروروں اور متکبروں کی چال ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ تم کتنا ہی زمین پر پاؤں مارتے ہوئے چلو، لیکن اِس کو پھاڑ نہیں سکتے اور کتنا ہی اترا کر اور سر اٹھا کر چلو، لیکن پہاڑوں کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے۔

اِس طرح کی چال، ظاہر ہے کہ آدمی کے باطن کی ترجمان ہوتی ہے۔ دولت، اقتدار، حسن، علم، طاقت اور ایسی ہی

دوسری جتنی چیزیں آدمی کے اندر غرور پیدا کرتی ہیں، اُن میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اُس کی چال کے ایک مخصوص ٹائپ میں نمایاں ہوتا اور اِس بات پر دلیل بن جاتا ہے کہ اُس کا دل بندگی کے شعور سے خالی ہے اور اُس میں خدا کی عظمت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جس دل میں بندگی کا شعور اور خدا کی عظمت کا تصور ہو، وہ اُنھی لوگوں کے سینے میں دھڑکتا ہے جن پر تواضع اور فروتنی کی حالت طاری رہتی ہے۔ وہ اکڑنے اور اترانے کے بجائے سر جھکا کر چلتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ انسان کا یہ غرور و تکبر صرف اُس کی چال میں ظاہر نہیں ہوتا، اُس کی گفتگو، وضع قطع، لباس اور نشست و برخاست، ہر چیز میں نمایاں ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر ایسی تمام چیزوں کے استعمال سے منع کیا ہے جن سے امارت کی نمایش ہوتی ہو یا وہ بڑائی مارنے، شیخی بگھارنے، دون کی لینے، دوسروں پر رعب جمانے یا اوباشوں کے طریقے پر دھونس دینے والوں کی وضع سے تعلق رکھتی ہوں۔ ریشم پہننے، قیمتی کھالوں کے غلاف بنانے اور سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے سے آپ نے اِسی لیے روکا ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹی ڈاڑھی اور بڑی بڑی مونچھیں رکھنے والوں کو بھی یہ متکبرانہ وضع ترک کر دینے کی نصیحت کی اور فرمایا ہے کہ وہ ڈاڑھی بڑھا لیں، لیکن مونچھیں ہر حال میں چھوٹی رکھیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ جس نے اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے کوئی لباس پہنا، اللہ اُسے قیامت میں ذلت کا لباس پہنائے گا، پھر اُس میں آگ بھڑکا دی جائے گی۔ اِسی طرح فرمایا ہے: اللہ قیامت کے دن اُس شخص کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا جو غرور سے اپنا تہ بند گھسیٹتا ہوا چلتا ہو۔

پھر یہی نہیں، انسان کی یہ نفسی کیفیت بعض بڑے بڑے گناہوں کا باعث بھی بنتی ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ حق کو حق سمجھتے ہوئے اُس کی تکذیب کر دینے، رنگ و نسل اور حسب و نسب کے اعتبار سے اپنے آپ کو برتر سمجھنے، دوسروں کو حقیر سمجھ کر اُن کا مذاق اڑانے، اُن پر طعن کرنے، بُرے القاب دینے اور پیٹھ پیچھے اُن کے عیب اچھالنے جیسے گناہوں کا محرک انسان کا یہی پندار نفس اور غرور و تکبر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِن سب چیزوں سے بھی نہایت سختی کے ساتھ روکا ہے۔

تورات کے احکام کی طرح یہ قرآن کے احکام عشرہ ہیں۔ تمام اخلاقیات اِنھی دس احکام کی فرع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن گناہوں کو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے تعبیر کیا ہے، وہ اِنھی احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اِس خلاف ورزی کی سزا لوگوں کو قیامت میں بھگتنا پڑ سکتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان اِس معاملے میں متنبہ رہے۔ اِس کے لیے یہ تین باتیں پیش نظر رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ اِن میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی اگر نادانستہ ہوئی ہے تو اللہ اُس پر گرفت کرنے والا نہیں ہے۔ اُس کا قانون یہ ہے کہ اگر بلا ارادہ کوئی ایسی بات ہو جائے جو بظاہر تو ایک ممنوع فعل ہو، مگر اُس میں درحقیقت اُس ممنوع

فعل کی نیت نہ ہو تو اُس پر وہ کوئی مواخذہ نہ کرے گا۔

دوسری یہ کہ اِن احکام کی خلاف ورزی سے کوئی شخص اگر اپنے آپ کو بچائے رکھتا ہے تو اُس کا صلہ یہ ہے کہ اُس کے چھوٹے گناہوں کو اللہ تعالیٰ اپنی بے پایاں رحمت سے معاف فرما دیں گے، ورنہ چھوٹے اور بڑے سب گناہ اُس کے اعمال نامے میں درج ہوں گے اور اُسے اُن کا حساب دینا پڑے گا۔

تیسری یہ کہ جذبات سے مغلوب ہو کر اگر کوئی شخص اِن میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھتا ہے تو اُسے توبہ کر کے اپنے رویے کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو، توبہ کر لی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح کر دیا ہے کہ اُس کے اوپر صرف اُنھی لوگوں کی توبہ کا حق قائم ہوتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ اُن لوگوں کی توبہ اللہ کے نزدیک کوئی توبہ نہیں ہے جو زندگی بھر گناہوں میں ڈوبے رہتے اور جب دیکھتے ہیں کہ موت سر پر آن کھڑی ہوئی ہے تو توبہ کا وظیفہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اِسی طرح جانتے بوجھتے حق کا انکار کر دینے والوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے، اگر وہ موت کے وقت تک اِس انکار پر قائم رہے ہوں۔

توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کی یہ دو صورتیں قرآن نے متعین کر دی ہیں۔ اِس کے بعد صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی شخص گناہ کے بعد جلد ہی توبہ کر لینے کی سعادت تو حاصل نہیں کر سکا، لیکن اُس نے اتنی دیر بھی نہیں کی کہ موت کا وقت آن پہنچا ہو۔ اِس صورت کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ یہ خاموشی جس طرح امید پیدا کرتی ہے، اِسی طرح خوف بھی پیدا کرتی ہے اور قرآن کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ خوف و رجا کے درمیان ہی رہے۔ اِسی طرح کے لوگ ہیں جن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے۔

جمال و کمال

انسان کے اخلاقی وجود کا حسن جب خلق اور خالق، دونوں کے معاملے میں درجۂ کمال کو پہنچتا ہے تو اُس سے جو اوصاف پیدا ہوتے ہیں یا قرآن کی رو سے ہونے چاہییں، وہ سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۳۵ میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ دس چیزیں ہیں اور پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اِن پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ دین کا جمال و کمال قرآن کے نزدیک یہی ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو اِسی تک پہنچنے اور اِسی کو پانے کی دعوت دیتا ہے۔

یہ اوصاف درج ذیل ہیں:

اسلام

پہلی چیز اسلام ہے۔ یہ جب اِس طریقے سے ایمان کے ساتھ آتا ہے، جس طرح یہاں آیا ہے تو اِس سے دین کا ظاہر مراد ہوتا ہے۔ یعنی وہ ہدایت جو انسان کے قول و فعل اور اعضا و جوارح سے متعلق ہے۔ چنانچہ آدمی کی زبان اگر اللہ و رسول کے حکم پر کھلنے اور بند ہو جانے کے لیے آمادہ ہے، اُس کی آنکھیں اگر اُن کے ایما سے دیکھنے اور جھک جانے کے لیے تیار ہیں، اُس کے کان اگر اُن کی ہدایت پر سننے اور سننے سے انکار کر دینے کے لیے مستعد ہیں، اُس کے ہاتھ اگر اُن کے ارشاد سے اٹھنے اور گر جانے کے منتظر ہیں اور اُس کے پاؤں اگر اُن کے فرمان پر چلنے اور رک جانے سے گریز نہیں کرتے تو یہی اسلام ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کا بہترین نمونہ بھی انبیا علیہم السلام ہی ہیں۔ لہٰذا ہدایت کی گئی ہے کہ تسلیم و رضا کے اِس مرتبے تک پہنچنے کے لیے لوگ اُن ہستیوں کی اتباع کریں جنھیں اللہ نے اُن کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

ایمان

دوسری چیز ایمان ہے۔ یہ دین کا باطن ہے اور یہاں اِس سے مراد وہ یقین ہے جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے دعووں کے بارے میں اُس کی حقیقی معرفت کے ساتھ پایا جائے۔ چنانچہ جو خدا کو اِس طرح مانے کہ تسلیم و رضا کے بالکل آخری درجے میں اپنے دل و دماغ کو اُس کے حوالے کر دے، قرآن کی اصطلاح میں وہ مومن ہے۔ دل کو طہارت، عقل کو روشنی اور ارادوں کو پاکیزگی اِسی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی ایمان ہے جو علم و عمل، دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا اور انسان کے پورے وجود پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ کے ذکر اور اُس کی آیتوں کی تلاوت اور انفس و آفاق میں اِن آیتوں کے ظہور سے اُس میں افزونی ہوتی ہے۔ یہی ایمان ہے جس کا یہ تقاضا قرآن میں بیان ہوا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی اِس کے حاملین کو اللہ و رسول سے زیادہ محبوب نہیں ہونی چاہیے۔

قنوت

تیسری چیز قنوت ہے۔ یہ وہ قلبی کیفیت ہے جو انسان کو پورے اخلاص اور یک سوئی کے ساتھ دائماً اپنے پروردگار کی اطاعت پر قائم رکھتی ہے۔ بندۂ مومن کے نہاں خانۂ وجود میں عبد و معبود کے تعلق کا سب سے نمایاں ظہور یہی ہے۔ چنانچہ قانتین وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ بندگی میں رہیں۔ غم، خوشی، جوش، ہیجان اور لذت و الم کی کسی حالت میں بھی

اپنے خالق سے سرکش نہ ہوں۔ شہوت کا زور، جذبات کی یورش اور خواہشوں کا ہجوم بھی اُنھیں خدا کے سامنے کبھی بے ادب نہ ہونے دے۔ اُن کا دل خدا کا عرش ہو اور اُس کی شریعت کو وہ حضوری میں دیا گیا حکم سمجھیں جس سے سرتابی کا تصور بھی دربار میں کھڑا ہوا کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ یہ، اگر غور کیجیے تو وہی کیفیت ہے جس کا اظہار یہ پورا عالم اور اِس کی تمام مخلوقات زبان حال سے کر رہی ہیں۔

صدق

چوتھی چیز صدق ہے۔ یہ قول و فعل اور ارادہ، تینوں کی مطابقت اور استواری کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ آدمی کے منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، اُس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ ہو اور وہ اپنی ہر بات کو نباہ دے تو یہ زبان اور عمل کی سچائی ہے، لیکن اِس کے ساتھ نیت اور ارادے کی سچائی بھی لازماً شامل ہونی چاہیے۔ قرآن نے اِس کے ضد کردار کو نفاق اور اِسے اخلاص سے تعبیر کیا ہے، پھر جگہ جگہ وضاحت فرمائی ہے کہ خدا کے نزدیک عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو کارگاہ قلب میں تیار کیا جائے، لہٰذا صدق کا درجۂ کمال قول و فعل اور ارادے کی اِسی مطابقت سے حاصل ہوتا ہے۔

صبر

پانچویں چیز صبر ہے۔ یہ اپنے ابتدائی مفہوم میں نفس کو اضطراب اور بے چینی سے روکنے کے لیے آتا ہے۔ پھر اِس سے مشکلات اور موانع کے علی الرغم پامردی، استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے موقف پر جمے رہنے کے معنی اِس میں پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جسے بے بسی اور درماندگی کی حالت میں مجبوراً اختیار کیا جائے، بلکہ عزم و ہمت کا سرچشمہ اور تمام سیرت و کردار کا جمال و کمال ہے۔ اِسی سے انسان میں یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے ناخوشگوار تجربات پر شکایت یا فریاد کرنے کے بجائے وہ اُنھیں رضامندی کے ساتھ قبول کر لے اور خدا کی طرف سے مان کر اُن کا استقبال کرے، نتیجۂ عمل میں تاخیر سے پریشان نہ ہو، اضطراب اور بے چینی سے بچا رہے، برائی کرنے والوں کے لیے بھی اپنے دل میں انتقام کا کوئی جذبہ نہ پیدا ہونے دے، حق کی مدافعت کا موقع ہو تو موت کو سامنے دیکھ کر بھی ثابت قدم رہے، رنج و راحت کی ہر حالت میں ضبط نفس سے کام لے اور جس چیز کو قرض و واجب سمجھے، تمام عمر اُس کی پابندی کرتا رہے۔

انسان کی سیرت کا یہی پہلو ہے جس سے خدا اور بندے کے درمیان وہ تعلق قائم ہوتا ہے جسے توکل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ہر حال میں خدا ہی پر بھروسا کیا جائے۔ 'اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ' اِسی تفویض اور سپردگی کا کلمہ ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ اُن لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے خاص الطاف وعنایات ہیں جو اِس کلمے پر قائم رہتے اور اِسی پر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

خشوع

چھٹی چیز خشوع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور اُس کی عظمت وجلال کے صحیح تصور سے جو تواضع، عجز اور فروتنی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے، قرآن اِسے خشوع سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ایک قلبی کیفیت ہے جو اُسے خدا کے سامنے بھی جھکاتی ہے اور دوسرے انسانوں کے لیے بھی اُس کے دل میں رحمت ورأفت کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔

پہلی صورت میں اِس کا بہترین اظہار نماز، بالخصوص شب کی نمازوں میں ہوتا ہے، جب بندۂ مومن دنیا کی سب چیزوں سے الگ ہو کر تنہا اپنے پروردگار سے سرگوشیاں کرتا اور اپنی تنہائیوں کو اُس کے ذکر وشکر سے معمور کر دیتا ہے۔

دوسری صورت میں یہ کیفیت بندۂ مومن کی پوری شخصیت پر اثر انداز ہوتی اور اُسے اپنے اہل وعیال کے لیے سراپا شفقت، اپنے دوستوں، پڑوسیوں اور ملنے والوں کے لیے سراسر رحمت اور اپنے معاشرے کے لیے ایک سرچشمۂ ہدایت بنا دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے ہی حلیم اور مہربان انسانوں سے وہ تمدن وجود میں آتا ہے جو زمین پر خدا کی جنت اور ہر سلیم الفطرت انسان کا مطمح نظر اور اُس کی آرزووں کا محور ہوتا ہے۔

صدقہ

ساتویں چیز صدقہ ہے۔ اللہ کی راہ میں انفاق کا ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال میں سے فرض زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں سے زیادہ جو کچھ ہو، اُسے معاشرے کا حق سمجھے اور جب کوئی مطالبہ سامنے آئے تو اُسے فراخ دلی کے ساتھ پورا کر دے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کو دبا کر اور اپنی ضرورتوں میں ایثار کر کے بھی وہ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرے۔ صدقہ دینے والوں کی تعبیر اِن سب صورتوں کو شامل ہو سکتی ہے، لیکن بیان اوصاف کے موقع پر جب یہ تعبیر اختیار کی جائے گی تو اِس سے اشارہ اصلاً اُس کے درجۂ کمال ہی کی طرف ہو گا۔ یعنی جو سخی اور فیاض ہو اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ

دے۔ بندوں کے تعلق سے یہ اُسی خشوع کا اظہار ہے جو اِس سے پہلے مذکور ہے۔ نماز اور انفاق کا ذکر قرآن میں اِسی بنا پر ساتھ ساتھ آتا ہے۔

روزہ

آٹھویں چیز روزہ ہے۔ یہ ضبط نفس اور تربیت صبر کی خاص عبادت ہے۔ قرآن میں اِس کا مقصد یہ بیان ہوا ہے کہ اِس سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ روزے رکھنے والوں کی تعبیر جب بیان اوصاف کے موقع پر آئے گی، تو اِس سے مراد وہ لوگ ہیں جو تقویٰ کے ایسے حریص ہیں کہ اِس کے لیے زیادہ تر روزے سے رہتے ہیں۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ معلوم ہوئی کہ وہ منکرات سے بچتے، فواحش سے اجتناب کرتے اور اپنی زندگی میں تمام اخلاق عالیہ کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔

حفظ فروج

نویں چیز حفظ فروج ہے۔ یعنی جو شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ ضبط نفس اور تقویٰ کا ثمرہ ہے۔ برہنگی، عریانی اور فواحش سے اجتناب کرنے والوں کے لیے یہ تعبیر قرآن میں کئی جگہ آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی عفت و عصمت کی بالکل آخری درجے میں حفاظت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے جہاں اجازت دی ہے، اُس کے سوا خلوت و جلوت میں اپنا ستر وہ کسی کے سامنے نہیں کھولتے اور نہ کوئی ایسا لباس کبھی پہنتے ہیں جو اُن اعضا کو نمایاں کرنے والا ہو جو اپنے اندر کسی بھی لحاظ سے جنسی کشش رکھتے ہیں۔ فواحش سے اجتناب کا یہی درجہ ہے جس سے وہ تہذیب پیدا ہوتی ہے جس میں حیا فرماں روائی کرتی اور مرد و عورت، دونوں اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ کھولنے کے بجائے، جہاں تک ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھنے کے لیے مضطرب ہوتے ہیں۔

ذکر کثیر

دسویں چیز ذکر کثیر ہے۔ یعنی اللہ کو بہت زیادہ یاد کیا جائے۔ بندۂ مومن کے دل میں جب اپنے پروردگار کا خیال پوری طرح بس جاتا ہے تو پھر وہ مقررہ اوقات میں کوئی عبادت کر لینے ہی کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ ہمہ وقت اپنی زبان کو خدا کے ذکر سے تر رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی دیکھتا ہے تو 'سبحان اللہ' کہتا ہے۔ کسی کام کی ابتدا کرتا

ہے تو 'بسم اللہ' سے کرتا ہے۔ کوئی نعمت پاتا ہے تو 'الحمد للہ' کہہ کر خدا کا شکر بجالاتا ہے۔ 'اِن شاء اللہ' اور 'ماشاء اللہ' کے بغیر اپنے کسی ارادے اور کسی عزم کا اظہار نہیں کرتا، اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد چاہتا ہے۔ ہر آفت آنے پر اُس کی رحمت کا طلب گار ہوتا ہے۔ ہر مشکل میں اُس سے رجوع کرتا ہے۔ سوتا ہے تو اُس کو یاد کر کے سوتا ہے اور اٹھتا ہے تو اُس کا نام لیتے ہوئے اٹھتا ہے۔ غرض ہر موقع پر اور ہر معاملے میں اُس کی زبان پر اللہ ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر یہی نہیں، وہ نماز پڑھتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، روزہ رکھتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، انفاق کرتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، برائی سے بچتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، اُس کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے اور فوراً اُس سے رجوع کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ اِس ذکر کی ایک صورت فکر بھی ہے۔ خدا کی اِس دنیا کو دیکھیے تو اِس میں ہزاروں مخلوقات ہیں، اُن کی رنگارنگی اور بوقلمونی ہے، پھر عقل انسانی اور اُس کے کرشمے ہیں، سمندروں کا تلاطم ہے، دریاؤں کی روانی ہے، لہلہاتا سبزہ اور آسمان سے برستا ہوا پانی ہے، لیل ونہار کی گردش ہے، ہوا اور بادلوں کے تصرفات ہیں، زمین وآسمان کی خلقت اور اُن کی حیرت انگیز ساخت ہے، اُن کی نفع رسانی اور فیض بخشی ہے، اُن کی مقصدیت اور حکمت ہے، پھر انفس وآفاق میں خدا کی وہ نشانیاں ہیں جو ہر آن نئی شان سے نمودار ہوتی ہیں۔ بندۂ مومن اِن آیات الٰہی پر غور کرتا ہے تو اُس کے دل ودماغ کو یہ خدا کی یاد سے بھر دیتی ہیں۔ چنانچہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ پروردگار، یہ کارخانہ تو نے عبث نہیں بنایا۔ تیری شان علم وحکمت کے منافی ہے کہ تو کوئی بے مقصد کام کرے۔ میں جانتا ہوں کہ اِس جہان رنگ وبو کا خاتمہ لازماً ایک روز جزا پر ہوگا جس میں وہ لوگ عذاب اور رسوائی سے دوچار ہوں گے جو تیری اِس دنیا کو کسی کھلنڈرے کا کھیل سمجھ کر اِس میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُن کے انجام سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔
